3462

شیرازہ

جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز

3462

ماہنامہ

شیرازہ

سرینگر، کشمیر

جلد: ۴۶ شمارہ: ۳

نگران:

ظفر اقبال منہاس

مُدیر:

محمد اشرف ٹاک

جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز

ناشر : سیکریٹری، جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز

کمپوزنگ: بشارت احمد بابا

مطبع: جے، کے، آفیسٹ پرنٹرس۔ نئی دہلی

تصاویر: غلام محی الدّین

شیرازہ میں جو مضامین شائع ہوتے ہیں اُن میں ظاہر کی گئی آراء سے اکیڈیمی یا اِدارے کا کُلّا یا جُزواً اتفاق ضروری نہیں۔

سَرورق عمل: بشیر احمد

☆.....خط و کتابت کا پتہ:

محمّد اَشرف ٹاک

ایڈیٹر ''شیرازہ'' اردو

جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز

سرینگر / جموں

فہرست

☆ حرفِ آغاز — محمد اشرف ٹاکہ — ۴

☆ کشمیر میں ترقی پسند ادب کی تحریک — غلام نبی خیال — ۵

☆ میں نے لاہور دیکھ لیا — پدما سچدیو — ۱۸

☆ بے ہمہ و باہمہ — سیّد رسول پونپُر — ۳۴

نظمیں

☆ ماں — فاروق مضطر — ۴۴

☆ ایک بلا عنوان نظم، تحقیق — بلراج بخشی — ۴۶/۴۷

☆ سرکارِ دو عالم کا ادبی ذوق — تنہا نظامی — ۴۹

☆ انصاف (تمثیلچہ) — م۔م۔راجندر — ۶۸

غزلیں

☆ کشمیری لال ذاکر ۸۴ محبوب راہی ۸۵ رفیق شاہین ۸۶ عذرا پروین ۸۸

☆ فرید پربتی ۹۱ نوشاد احمد کریمی ۹۴ انیس امام ۹۶ غلام نبی ساگر (غافل) ۹۷

افسانے

☆ اوور بجٹ — اشتیاق سعید — ۹۹

☆ چاہت کے رنگ — یٰسین احمد — ۱۰۴

☆ منظروں کا زوال — عظیم راہی — ۱۰۸

تبصرہ کتب — ''منتخب کشمیری افسانے'' — سیّد رسول پونپُر — ۱۱۵

☆

حرفِ آغاز

ترقی پسند تحریک نے ہمارے ہاں مختلف زبانوں کے ادبیات پر گہرے اور دور رس اثرات مرتب کئے ہیں اور اِسے ایک نئی سمت عطا کی ہے۔ کشمیر بیسویں صدی کی چوتھی اور پانچویں دہائی میں یہ تحریک کافی زوروں پر تھی۔ اِس کے ساتھ نہ صرف مصنفین بلکہ مصوّر اور تھیٹر بھی سرگرم عمل تھے۔ اُن ہی دِنوں ایک مؤقر ادبی جریدہ ''کونگ پوش'' کا اجراء بھی کیا گیا۔ یہ سب چیزیں بہر حال ہماری ادبی تاریخ کے مختلف پڑاو ہیں جن پر وضاحت کے ساتھ بہت کم لکھا گیا ہے۔ جناب غلام نبی خیال نے اِس جانب توجہ کر کے ہمیں مضمون عطا کیا ہے جو معلومات افزاء ہونے کے ساتھ دلچسپ بھی ہے۔

☆

سیّد میر قاسم ۱۹۷۰ء سے ۱۹۷۵ء تک ریاست کے وزیرِ اعلیٰ ہونے کے ناطے کلچرل اکیڈیمی کے صدر رہے۔ علمی ادبی اور ثقافتی معاملات سے اُن کی بے پناہ دلچسپی کے سبب وہ اکیڈیمی کے خدوخال سنوارنے میں پیش پیش رہے۔ سیّد رسول پونپر نے سیّد میر قاسم کے ساتھ روابط اور اُن کی شخصیت کے بعض گوشوں کو اُجاگر کرنے والا مضمون مرحمت فرمایا ہے جو کہ شاملِ اشاعت ہے۔

☆

ہمیں اُمید ہے کہ شمارے میں شاملِ دیگر مشمولات بھی آپ کی پسندیدگی کا درجہ حاصل کر لیں گی۔ اپنی آراء سے ہمیں نوازیں کیوں کہ اُن کی روشنی میں ہمیں آگے بڑھنے کا حوصلہ ملتا ہے۔

محمد اشرف ٹاک

غلام نبی خیالؔ

کشمیر میں ترقی پسند اَدب کی تحریک

1950 عیسوی میں ہم جوانی کی دہلیز پر قدم رکھنے والے تھے۔

اُن دنوں کشمیر میں ترقی پسند اَدیبوں کی تحریک زوروں پر تھی اور اِس تحریک کے ساتھ وادیٔ کشمیر کے اکثر باشعور اور ہوش مند ادیب، شاعر اور دانشور وابستہ ہو چکے تھے۔ یہ فہرست اِتنی طولانی ہے کہ اِسے مکمل طور پر دَرج کرنا نہایت مشکل ہوگا البتہ تحریک کے علمبرداروں میں غلام احمد مہجورؔ کشمیری۔ عبدالستار عاصیؔ۔ غلام نبی عارضؔ۔ عبدالستار رنجورؔ۔ مرزا غلام حسن بیگ عارفؔ۔ دینا ناتھ نادمؔ۔ امین کاملؔ۔ غلام نبی فراقؔ۔ نور محمد روشنؔ۔ رحمان راہیؔ۔ نند لال امبارداؔر۔ شیام لال در بہارؔ۔ دینا ناتھ المستؔ۔ اَمر چند ولیؔ۔ عزیز ہارونؔ۔ سوم ناتھ زتشیؔ۔ عبدالمجید سائرؔ۔ غلام احمد نازؔ اور عبدالرحمان راحتؔ وغیرہ پیش پیش تھے اور اس کارواں کے دیگر رہروؤں میں اختر محی الدینؔ۔ بنسی نردوشؔ۔ حبیب کامرانؔ۔ اکبر لداخیؔ۔ تاج بیگم ریزوؔ۔ اُمیش کولؔ۔ پریم ناتھ پریمیؔ۔ ارجن دیو مجبورؔ۔ تیج بہادر بھانؔ۔ شریدر رینہ زارؔ۔ موتی لال ساقیؔ۔ محمد عبداللہ عارجؔ۔ ترلوکی ناتھ کندنؔ۔ دیپک کولؔ۔ چمن لال چمنؔ۔ مکھن لال بے کسؔ۔ فارق بڈگامیؔ۔ مظفر عازمؔ اور غلام نبی خیالؔ شامل تھے۔

کشمیر میں اِس تحریک کو پہلے پہل قومی کلچرل فرنٹ کے نام سے موسوم کیا گیا

جس نے بعد میں کلچرل کانگریس اور پھر کلچرل کانفرنس کی شکل اختیار کر لی۔ اصل میں اِس کے اَدبی شعبے کو انجمنِ ترقی پسند مصنفین کے نام پہچانا جاتا تھا جس کے ساتھ ترقی پسند مصورین اور ترقی پسند تھیٹر بھی ساتھ ساتھ سرگرم عمل تھے۔ اِن شعبوں میں سوم ناتھ بھٹ۔ تریلوک کول۔ کشوری کول۔ غلام رسول سنتوش۔ نثار عزیز۔ پران کشور۔ پرتھوی ناتھ کاچرو اور موہن لال آیمہ دِل و جان سے اس تحریک کی آبیاری کرتے رہے۔

1951ء میں قومی کلچرل کانگریس کے جو انتخابات ہوئے اُن کی رُو سے غلام محمد صادق اس کے صدر۔ جسٹس جیالال کلمِ۔ غلام احمد مہجور اور عبدالرحمان راحت نائب صدور۔ دینا ناتھ نادم جنرل سیکرٹری۔ شیلا بھاٹیہ سیکرٹری اور مسِ محمودہ احمد علی شاہ خزانچی منتخب ہوئے۔ رحمان راہی۔ نور محمد روشن اور سوم ناتھ بھٹ کو بالترتیب انجمنِ ترقی پسند مصنفین۔ ترقی پسند تھیٹر اور ترقی پسند مُصورین کا جنرل سیکرٹری مقرر کیا گیا۔

کلچرل کانفرنس کی طرف سے اُن دنوں ہر جمعہ کو بعد دوپہر ہفت روزہ اُدبی نشستیں منعقد ہوا کرتی تھیں جن میں ادیب اور شاعر اَپنی تازہ تخلیقات سُناتے تھے اور پھر گھنٹوں تک اُن پر ایک بے لاگ اور بیباک اَنداز میں زبردست اور گرما گرم بحث ہوا کرتی تھی۔ یہ ساری کارروائی کئی سال تک غلام نبی فراق باقاعدہ طور پر قلم بند کرتے رہے۔ چونکہ اِس اَدبی تحریک کے محرکات میں ہندوستان میں پیدا شدہ سامراج مخالف اور ترقی پسند عوامل کا عمل دخل تھا لہذا فنی تخلیقات کو بھی اِسی طرح کی کسوٹی پہ پرکھا جاتا تھا۔ یعنے ترقی پسند اصطلاح میں صحیح اور بامعنے شاعری یا اَدب وہی

تھا جس میں زندگی سے پیار۔ موت سے مقابلہ اور مارکسی فلسفہ حیات کی تائید و توثیق کے خیالات پیش کیے گئے ہوں۔ اگر کسی بھی فن پارے میں قنوطیت۔ زندگی سے فرار یا موت کو ایک دہشت ناک حقیقت کے رُوپ میں پیش کرنے کی کوشش نظر آتی تو اِسے رجعت پسندی کا ماحصل قرار دے کر سرے سے ہی رد کر لیا جاتا اور اس فن پارے کے خالق کو تاکید کی جاتی کہ وہ مارکس۔ لینن اور انجلز کا مطالعہ کر کے زندگی کو حقیقی تناظر میں ذہن نشین کرنے کی کوشش کرے۔ اِس نظریہ کی تائید میں ہم مُشتے نمونہ اَز خروارے کے مصداق دینا ناتھ نادم اور امین کامل کی اُن دنوں کی اُردو شاعری کے مختصر نمونے یہاں پیش کرتے ہیں:

تقدیر کے وعدوں پہ بھلا تکیہ کہاں تک؟
عزم و عمل سے قسمتِ انساں کو بدل دو
اِک انقلاب سے ہے پھر وابستہ اُمیدیں
ایماں اگر مانع ہے تو ایماں کو بدل دو
بھڑکا نہ سکے آگ جو تڑپا نہ سکے خون
اُس شاعرِ بے شرم بے ایماں کو بدل دو

(دینا ناتھ نادم)

سامراج سے خطاب

تیرے ایٹم بم سے اے مغرب کے میرِ سامراج
تو سمجھتا ہے کہ قصرِ زندگی ڈھہ جائے گا

تیرے اِس بم کے دھوئیں کی آڑ ہی میں زندگی
موت پر چھائے گی تُو سر پیٹتا رہ جائے گا

(امین کامل)

اِس سلسلے میں ایک واقعہ یاد آجاتا ہے۔

میں اُنہی دنوں کانفرنس کی ان ہفتہ وار میٹنگوں میں شرکت کرنے کا آغاز کر چکا تھا۔

سب سے پہلی میٹنگ میں، جس میں میں نے شمولیت کی، مجھے اختر محی الدین۔ امین کامل۔ اَمر چند وکی اور اُن کے برادر دینا ناتھ المست کشمیری اور دینا ناتھ نادم سے متعارف ہونے کا موقعہ نصیب ہوا۔ یہ نشست اُس تین منزلہ مکان کے بالائی حصے میں منعقد ہوئی تھی جو مائسمہ کی بستی کے نزدیک کوکر بازار کی اُس گلی میں واقع تھا جسکی پہلی منزل میں نور محمدی لیتھو پریس نصب تھا۔

اس نشست میں میں نے ایک کشمیری غزل پڑھ کر سُنائی جس کا مقطع یوں تھا:

شوقہ سان آیوے دلبر گوکھ واتھہ اندمزار
کیاہ خیالو در شناہ گوڈہ کرِ زہ ہے اُدہ مرِ زہِ ہے

(آج تمہارا محبوب وفورِ شوق میں تمہارے پاس آیا تھا کہ تمہاری میّت قبرستان پہنچائی جارہی تھی۔ اے خیال! پہلے اپنے معشوق کا دیدار تو کر لیتے اور پھر مرجاتے)

یہ مقطع سنتے ہی کئی شُرکائے محفل برافروختہ ہو گئے اور مجھ پر برس پڑے کہ

میں نے اس غزل میں موت کا ذکر کیا ہے اور زندگی سے مُنہ موڑ لیا ہے جو رجعت پسندی اور بورژواذہن کی علامت ہے۔ لہذا مجھے اس مقطع کے مفہوم کو فوراً بدل دینا چاہیئے۔ اِس گرم گفتاری میں دینا ناتھ نادم نے مداخلت کرتے ہوئے گرم دماغ رکھنے والے ادیبوں کو یہ کہہ کر خاموش کر دیا کہ میں ابھی ایک نو آموز شاعر ہوں اور ترقی پسندی کے رموز و اسرار سمجھتے سمجھتے ہی سمجھ پاؤں گا لہذا فی الحال اِس چھوٹی سی بات کو نظر انداز بھی کیا جا سکتا ہے۔ نادم صاحب کی شخصیت شروع سے لے کر اُن کے انتقال تک مجھے ایک نہایت ہی پیاری شخصیت کی شکل میں برابر مُتاثر کرتی رہی۔

اپنے نظریاتی عقائد کی تشہیر کی غرض سے ہم نوجوانوں کو بزرگ کمیونسٹ بار بار ہدایت دیتے تھے کہ ہمیں صحیح معنوں میں ترقی پسند دانشور بننے کی خاطر کارل مارکس کی کتاب داس کپتال اور ماوزے تنگ کی کتاب اُ حمر کا مطالعہ اس طرح کرنا چاہیے گویا وہ مقدس صحائف ہوں۔ اِسی طرح اندازِ تخاطب کے لئے یہ ہدایت نامہ باقاعدہ طور پر جاری کیا جاتا تھا کہ ہر بڑے چھوٹے دوست کو کامریڈ کہہ کر پُکارا جائے۔ اِن ہدایات پر عمل کرتے ہوئے ہمیں ایک عجیب سی خوشی محسوس ہوتی تھی اور جب ہمیں بھی کوئی ساتھی کامریڈ کہہ کر آواز دیتا تو ہمیں ایسا لگتا تھا گویا ہم روس یا چین کے کوئی بہت بڑے سیاسی رہنما ہوں۔

کچھ عرصہ بعد کلچرل کانفرنس کا دفتر ریذیڈنسی روڈ پر واقع اس عمارت کی تیسری منزل میں ایک وسیع ہال میں منتقل ہوا جس کے نیچے چند سال قبل تک انڈیا کافی ہاوس موجود تھا۔

یہ اَدبی محفلیں زور وشور سے جاری رہیں اور ان کی بدولت کشمیر میں کئی نئے اور نوجوان چہرے اُبھرتے ہوئے شاعروں۔ ادیبوں۔ مُصوروں۔ فن کاروں اور کلاکاروں کی شکل میں سامنے آنے لگے۔

ان محفلوں میں اکثر وبیشتر مہجورؔ اور پریم ناتھ پردیسیؔ کا تذکرہ نہایت عزت واحترام کے ساتھ کیا جاتا تھا۔

ہماری ان دو مایہ ناز ہستیوں سے کبھی ملاقات نہیں ہوسکی۔ پردیسیؔ کی وفات سے پہلے مہجورؔ اپریل 1952ء میں اللہ کو پیارے ہو چکے تھے اور پردیسی کا 1955 میں جب انتقال ہوا تو ہم نے اُن کی یاد میں 12 جنوری 1955 کو ایک کشمیری نظم لکھی جو پہلے جالندھر سے شائع ہونے والے اُردو جریدے راہیؔ میں شائع ہوئی اور جسے بعد میں ہم نے اَپنے اوّلین کشمیری مجموعہ کلام ''پراگاش'' میں شامل کرلیا جو 1962ء میں اشاعت پذیر ہوا۔

ہم 1953ء کے آس پاس ترقی پسند ادبی تحریک میں شامل ہوئے تھے اور ہماری پہلی کشمیری شعری تخلیق ایک غزل کی صورت میں رسالہ ''گل ریز'' کے دسمبر 1954ء کے شمارے میں صفحہ نمبر 34 پر شائع ہوئی جو خیالؔ فاروقی کے نام سے چھاپی گئی۔ اُن دنوں ہم یہی قلمی نام رکھتے تھے۔

گل ریز کے مدیر و مالک مرزا عارف تھے جنہوں نے ایک سرکاری افسر ہونے کی بنا پر ترقی پسند تحریک کی صفوں سے رفتہ رفتہ کھسکنے کے بعد کشمیر بزم اُدب نام کی ایک دائیں بازو کی اَدبی انجمن قائم کی تھی جس کے سرگرم کارکنوں میں شہہ

زور کشمیری۔ شوریدہ کشمیری۔ عبدالحق برق اور محی الدین حاجنی شامل تھے۔ گل ریز اسی بزم کے اہتمام سے شائع ہوتا تھا۔

کشمیر میں ترقی پسند ادبی تحریک کے پسِ پردہ برِصغیر کے وہ نامور ادیب اور اُن کی تخلیقات اور نظریات کارفرما تھے جو اس تحریک کی بنیاد رسمی طور پر 1936ء میں سید سجاد ظہیر کی سربراہی میں ڈال چکے تھے۔ ان میں سجاد ظہیر کے علاوہ ڈاکٹر محمد دین تاثیر اور ملک راج آنند بھی شامل تھے جو لندن میں زیرِ تعلیم تھے اور وہیں پر اِس ہمہ گیر تحریک کے بانی ہونے کا شرف حاصل کر چکے تھے۔

کلکتہ میں اس تحریک کا آغاز 1936ء میں ہوا اور لکھنؤ کے ثقافتی شہر میں سجاد ظہیر ہی کی سربراہی میں ترقی پسند مصنفین نام کی تنظیم کا قیام 10 اگست 1936 کو عمل میں لایا گیا۔ اِس طرح سے یہ تحریک ہندوستان میں سرسید احمد خان کی تحریک برائے فروغِ علم کے بعد سب سے زیادہ با اثر اور با مقصد تحریک بن گئی جس کے علمبرداروں میں منشی پریم چند۔ ڈاکٹر رشید جہاں۔ فیض احمد فیض۔ محمود الظفر۔ پروفیسر احمد علی اور احمد ندیم قاسمی جیسے معتبر نام شامل ہیں۔

فی الحقیقت یہی تحریک ہندوستان اور بعد میں پاکستان کے ادبی میدان میں آئندہ نسلوں کی راہیں اور منزلیں متعین کرنے کا باعث بن گئی جس میں رفتہ رفتہ لاتعداد دانشور پورے ذوق وشوق سے شامل ہو کر اس کے نقیب بن گئے۔ ان میں جوش ملیح آبادی۔ کرشن چندر۔ مہندر ناتھ۔ خواجہ احمد عباس۔ مخدوم محی الدین۔ اسرار الحق مجاز۔ علی سردار جعفری۔ مجروح سلطان پوری۔ پرکاش پنڈت۔ مصطفٰے

زیدی تیغ الہ آبادی۔ خلیل الرحمان اعظمی۔ سید احتشام حسین۔ کیفی اعظمی۔ ساحر لدھیانوی۔ ظفر ادیب۔ معین احسن جذبی اور نوزائیدہ پاکستان میں فیض احمد فیض۔ احمد ندیم قاسمی۔ حبیب جالب۔ احسان دانش۔ فارغ بخاری اور خاطر غزنوی روشنی کے میناروں کی طرح جنوبی ایشیا کے مطلعِ اُردو پر اپنے فکر وفن کا نور نچھاور کرتے رہے۔

انہی خیالات کی مبلغ ایک اور ادبی انجمن حلقہ ارباب ذوق میں شامل ہو کر اوپندر ناتھ اشک۔ فکر تونسوی۔ کنہیالال کپور اور قرۃ العین حیدر نے ترقی پسند ادب کے نظریہ کو آگے بڑھایا۔

یہاں مقامی طور پر کشمیر میں ترقی پسند اَدیبوں نے ایک ہنگامی سوچ کے تحت ایک قسم کی بے راہ روی میں اَپنے اِسلامی نام اِس طرح سے بگاڑ دیئے کہ اُن سے کسی کی بندگی یا غلامی یا عبدیت کے محسوسات کو خارج کر دیا گیا۔

ساتھ ہی کشمیر کے ترقی پسند ادیبوں کے لئے روسی ادیبوں میکسم گورکی۔ میکایل شولوخوف۔ ترگنیف۔ چیخوف۔ پشکن اور داستویوسکی کی تخلیقات مقدس کتابوں کا درجہ حاصل کر چکی تھیں۔

انہی دنوں دینا ناتھ نادم چین کا دورہ کر کے کشمیر لوٹے تو وہ نیلے رنگ کا ایک شارٹ کوٹ پہنے ہوئے نظر آئے۔ مقامی اَدبی حلقوں میں یہ بات خوب چلی کہ یہ کوٹ اُنہیں پیکنگ میں چینی رہنما ماوزے تنگ نے تحفے میں دیا ہے۔ پھر کیا تھا۔ نادم کشمیر میں چینی انقلاب کی علامت بن گئے اور جب اُن سے کوئی پوچھتا کہ کیا واقعی

یہ کوٹ آپ کو ماوزے تنگ ہی نے دیا ہے تو وہ ایک ایسی دھیمی مسکراہٹ سے اس سوال کا خاموش جواب دیتے جس کے معنے اُن کے سوا اور کوئی سمجھ نہیں پاتا۔ نادم صاحب ہی بہتر جانتے تھے کہ کیا یہ کوٹ ماوزے تنگ ہی کا عطا کردہ تھا یا انہوں نے اسے پیکنگ کے کسی کباڑی بازار میں خریدا تھا۔

دینا ناتھ نادم کے ساتھ یہ دلچسپ واقعہ بھی وابستہ ہے کہ جب 1955ء میں سوویت یونین کے وزیراعظم مارشل بلگانن اور کمیونسٹ پارٹی کے جنرل سیکرٹری نکیتا خروشچوف کشمیر آئے تو سری نگر میں اُن کا جلوس کلچرل کانفرنس کے دفتر واقع ریذیڈنسی روڈ سے بھی گذرا۔ کانفرنس کے اراکین نے اُن پر پھولوں کی بارش کی اور تالیاں بجا بجا کر اُن کا خیر مقدم کیا۔ نادم پہلے ہی نیچے سڑک پر آ گئے تھے اور انہوں نے بُلگانن اور خروشچوف سے مصافحہ کر کے ترقی پسند ادبی حلقوں میں عظمت و تکریم کا ایک اور تاج پہن لیا۔ نادم کا یہ مصافحہ یہاں کی ادبی تحریک میں ایک پُرلطف حکایت بن کے رہ گیا۔

ہم نے بھی روسی رہنماؤں کے اعزاز میں ''استقبال'' کے عنوان سے ایک کشمیری نظم لکھی جو ''کونگ پوش'' کے مئی 1956 کے شمارے میں شائع ہوئی لیکن بعد میں ہم نے کونگ پوش کا یہ شمارہ ذاتی کتب خانے سے نکال کر اس نظم کے صفحات پر Cancelled لکھ دیا۔ معلوم نہیں کیوں؟

کلچرل کانفرنس کے اِس پُرشور اور اثر انگیز زمانے میں تین ایسے دلچسپ اور حیران کُن واقعات پیش آئے جو ہم یہاں بیان کرنا چاہیں گے تا کہ اُن کی روشنی میں

کانفرنس کے چند اراکین کی انفرادی اور ذاتی خصائص کی جھلک دیکھی جا سکے۔

کانفرنس کی ہفت روزہ نشستوں میں یہ معمول تھا کہ اگلی نشست کے لئے ایجنڈا پہلے ہی طے کیا جاتا تھا۔ ایک بار رحمان راہی نے کہا کہ وہ اگلی میٹنگ میں اپنی ایک اردو نظم سُنائے گا۔ راہی نے بھی اپنی شاعری کی شروعات اُردو ہی سے کی تھی۔

رحمان راہی نے جب یہ طویل نظم سُنائی تو حاضرین دم بخود رہ گئے کیونکہ اس نظم پر اوّل سے آخر تک آمرانہ تشدد کی چیرہ دستی۔ زندگی سے بیزاری اور موت کی سربراہی کے جذبات حاوی تھے۔ راہی کو بُری طرح ہدفِ تنقید بنایا گیا اور اسے قنوطی۔ بورژوا اور فراری کہا گیا۔ یہ ساری تضحیک سُن کر راہی نے یہ انکشاف کر کے محفل کو ایک بار پھر ورطہ حیرت میں ڈال دیا کہ یہ نظم اس کی اپنی طبع زاد تخلیق نہیں بلکہ عظیم ترقی پسند روسی ادیب میکسم گورکی کی ہے۔

اس پر محفل میں ایک اور ہنگامہ برپا ہوا اور راہی کو .....

قرار دیا گیا۔ چونکہ راہی کی پیش کردہ یہ نظم ایک اہم واقعہ کی مُحرک بنی تھی لہذا اسے محض اس کے مفہوم کی صورت میں یہاں پیش کیا جاتا ہے۔ یہ نظم رسالہ ''کونگ پوش'' کے چھ صفحات پر میکسم گورکی ہی کے نام سے شائع ہوئی ہے اور اسے من وعن نقل کرنا ہم ضروری نہیں سمجھتے۔ گورکی کے اس فن پارے کا لب لباب یوں ہے کہ ایک بادشاہ میدان کارزار میں مات کھا کر اپنے لئے نئی کمک لینے کی غرض سے واپس وطن لوٹ رہا تھا کہ اس کی نظر ایک خوبصورت دوشیزہ پر پڑ گئی جس نے بادشاہ کو دیکھ کر ایک قہقہہ بلند

کیا اور پھر زور زور سے ہنسنے لگی۔ شکست خوردہ بادشاہ برافروختہ ہوا اور اس نے اسے دھمکایا۔ دوشیزہ اس سے بولی کہ اس کا بادشاہ کی جنگ جوئی یا فتح و شکست کے ساتھ کوئی واسطہ نہیں بلکہ وہ خیالوں کی دنیا میں اپنے محبوب سے ہم کلام ہو کر ہنس رہی تھی۔ اس پر بادشاہ نے اس کی گردن زدنی کا حکم دیا اور اس جوان لڑکی کو تہہ تیغ کیا گیا۔

سوال یہ ہے کہ راہی نے گورکی کی یہ نظم اپنے آپ سے منسوب کر کے کیوں پڑھی اور ادیبوں کی ایک بھری محفل کو گمراہ کیوں کیا؟ اگر اس کے ذہن میں یہ خیال جنم لے چکا تھا کہ وہ ترقی پسندی کے چہرے سے نقاب اُٹھا کر اس فلسفہ کو بے حجاب کرے گا تو وہ خود اس گروہ میں شامل ہی کیوں ہوا تھا؟

گورکی نے یہ نظم اپنے کس عالم تفکر میں یا کس محسوساتی ردعمل کے طور پر لکھی تھی اس سے ہمیں فی الوقت غرض نہیں لیکن راہی کا اسے اپنی تخلیق جتا کر پیش کرنا اور اس کے ذریعہ ترقی پسند نظریات کو مضحکہ خیز انداز میں سامنے لانا سمجھ میں نہیں آتا۔

کلچرل کانفرنس کے عہدیداروں کے لئے جب سالانہ انتخابات کا عمل شروع ہوا تو حسب دستور یہ شرط دوہرائی گئی کہ تنظیم کا صرف وہی رکن انتخابات میں حصہ لے کر کسی بھی عہدہ کے لئے لڑ سکتا ہے جس کی کوئی بھی شعری یا نثری تخلیق کسی اخبار یا جریدے میں شائع ہو چکی ہو۔

مرحوم علی محمد طارق جنرل سیکرٹری بننے کے لئے حد سے زیادہ بیتاب نظر

آرہے تھے لیکن اُن کی کوئی تخلیق کہیں پر بھی شائع نہیں ہوئی تھی جس کی بنا پر انہیں انتخابات میں حصہ لینے سے محروم ہی ہونا پڑتا۔لیکن وہ ہار ماننے والوں میں سے نہیں تھے۔انہوں نے موقع کی نزاکت کا بھرپور فائدہ اُٹھاتے ہوئے راتوں رات ایک غزل تیار کرلی (یا کروائی؟) اور اگلی صبح اسے روزنامہ ''خدمت'' میں شائع کروا کے انتخاب میں شامل ہونے کا حق جتوا کر ہی دم لیا۔ان کی شومئی قسمت سے وہ بری طرح پٹ گئے اور رحمان راہی کو مصنفین کی انجمن کا جنرل سیکرٹری مقرر کیا گیا۔علی محمد طارق اس کے بعد سالہا سال تک جئے لیکن پھر کسی اخبار یا رسالہ میں ان کے قلم سے نکلا ہوا ایک شعر بھی ہمیں نظر نہیں آیا۔

کلچرل فرنٹ یا کلچرل کانفرنس کی طرف سے کشمیری زبان میں جو ماہنامہ ''کونگ پوش'' شائع ہوا کرتا تھا وہ ہماری ادبی دنیا کی سب سے بیش بہا دستاویز ہے۔ اس رسالے کے مشاورتی بورڈ اور مُدیران میں غلام محمد صادق۔مہجور۔مرزا عارف۔ دینا تا تھ نادم اور سوم ناتھ زتشی جیسے بڑے نام بھی شامل تھے۔لیکن انجمن کے سرکردہ زعماء کی عدم دلچسپی کی بنا پر جب یہ مشیران اور مُدیران کونگ پوش کی ناؤ منجدھار میں چھوڑ کر ساحل کی طرف بھاگنے لگے تو مارچ 1956 کے بعد نور محمد روشن۔عزیز ہارون اور غلام نبی خیال نے اس کی ادارت سنبھال لی۔

کونگ پوش کشمیر کی ادبی دنیا کا وہ واحد عہد ساز اور انقلاب آفرین جریدہ ہے جس نے چھ سال تک اپنی متواتر اشاعت سے یہاں کے ادیبوں اور فن کاروں کے سب سے بڑے کاروان کی رہنمائی کی۔کونگ پوش ہی میں اردو افسانہ نگار پریم

ناتھ پردیسی کا کشمیری ڈرامہ قُدہ گو جواری شائع ہوا۔ اسی رسالے کے ذریعہ کشمیری ادب پر تنقیدی مضامین کے سلسلے کا آغاز ہوا جس کی بنیاد شودان سنگھ چوہان۔ پرتھوی ناتھ پشپ اور امین کامل نے ڈالی۔ کونگ پوش ہی میں جہاں پہلی بار رحمان راہی کے لکھے ہوئے تاجکستان۔ ازبکستان۔ قزاقستان اور آذربائجان پر معلوماتی مضامین اشاعت پذیر ہوئے وہاں اس کے صفحات کو جن چنگ یو اور لنگ مین (چینی) گورکی اور چیخوف (روسی) ہرسٹولیمبر تنسکی (بلغاریہ) راج رتنم (تامل) اور کرشن چندر اور خواجہ احمد عباس (اردو) کے افسانوں کے کشمیری تراجم نے بھی زیب و زینت بخشی۔ یہی وہ رسالہ ہے جس میں پہلی بار کشمیری زبان کے دو اولین افسانے دینا ناتھ نادم کا جوابی کارڈ اور سوم ناتھ زتشی کا جب صبح ہوئی منظر عام پر آئے۔

بالآخر نومبر 1956ء میں کونگ پوش کا آخری شمارہ شائع ہوا اور اس کے بعد سالہا سال تک کشمیر کے ادبی اور ثقافتی ذہن کو مسحور و مخمور کرنے والے اس بے مثال جریدے کا سلسلہ اشاعت مُنقطع ہو گیا۔

"شیرازہ" میں کشمیری، ڈوگری، پنجابی، لداخی اور بلتی کی منظومات شائع ہوتی ہیں بشرطیکہ اُن کے ساتھ اُردو ترجمہ بھی شامل ہو۔ (ایڈیٹر)

پدما سچدیو*

میں نے لاہور دیکھ لیا

ٹھسا ٹھس بھرے جہاز میں ایک بچے کی پیاری آواز پُروائی کی طرح نمودار ہوئی، ''ابو اَب جہاز اُڑے گا''۔ اَبو کی آواز کہیں سے بھی نہیں آئی، مگر ایئر ہوسٹس کی آواز گونجی، ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، السلام علیکم..... خواتین و حضرات، اَب ہمارا جہاز لاہور کے لئے روانہ ہو رہا ہے۔ پاکستان کی تمام اُڑانوں پر تمباکو کی ممانعت ہے''

اُردو سن کر جی جڑا جاتا ہے۔ جیسے اَپنے آپ کو بہت دنوں بعد دیکھا ہو..... اَپنی بولی محبت کی بولی، نہ اُردو نہ ہندی، نہ ہندوستانی.....!

اُردو مجھے بہت اچھی لگتی ہے۔ یہ نہ صرف تہذیب و تمدن کی زبان ہے بلکہ محبّت کی زبان بھی ہے۔ ایک خوبصورت دُھن ہو جیسے۔ پہلے ستار کی دُھن پھر بانسری اور پھر وائلن کی دُھن جہاز میں بج اُٹھی ہے۔ جہاز اُڑ چلا ہے، مجھے اپنی ماں کی آواز جیسے سنائی دیتی ہے۔ 'اے کڑیئے تیری کھلڑی چے ڈرنی اے، جب تم میرے پیٹ میں تھیں تو تمہارے پتا جی مجھے لاہور دکھانے لے گئے تھے۔ اوہ! تو کیا میں اَب تک ماں کے پیٹ میں ہی تھی۔ آج پیدا بھی ہو گئی ہوں۔ کہتے بھی تو ہیں۔ 'جن لاہور نئیں ویکھیا او جمیا ہی نئیں' (جس نے لاہور نہیں دیکھا وہ پیدا ہی

*.....دہلی

نہیں ہوا)۔ لاہور کے دیوانے تو کم سے کم یہی کہتے ہیں۔

سحاب قزلباش پاکستان کی شاعرہ کہلاتی تھیں، پر پیدا دِلّی میں ہوئی تھیں۔ بٹوارے کے وقت اناؤنسر کی ایسی شہد گھلی آواز تھی کہ رونگٹے کھڑے ہو جائیں۔ دِلّی کلاتھ مل والوں کے مشاعرے میں تو اُن کا یہ شعر کس کو نہ رُلا گیا۔

دل میں یادوں کے لے کے افسانے
اے وطن آئے تیرے دیوانے

لندن اُن کا گھر بٹوارے کے پہلے کا ہندوستان تھا۔ ہائے رے سحاب آیا؟ پاکستان جا کر یہ بھی سنا کہ اَب وہ نہیں رہیں۔

جہاز کی کھڑکی کے باہر آسمان اُپنے محبوبی رنگ بکھرنے کے بعد حیران سا کھڑا ہے۔ دِلی دُور ہو چکی ہے۔ ایک کڑھائی کی ہوئی خوبصورت چٹائی کی طرح لاہور نیچے زمین پر بچھا پڑا ہے۔ چھوٹے چھوٹے گھر، باغ، پانی، ہریالی..... یہی لاہور ہے۔ اُونچی عمارتوں کے کبوتری ڈربے مجھے اچھے نہیں لگتے۔ زمین کا لمس نہ ملا تو کیا ملا.....!

ہوائی اڈے سے نکلنے میں کوئی پریشانی نہیں ہوئی۔ اڈے کے باہر پیلے گیندے کی مالائیں لئے لیکھک، دوست، ٹی وی اور اخباروں کے رپورٹر..... ہار بہت زیادہ..... میں نے بھی گلے میں ڈال لئے ہیں۔ یہ ساری بھیڑ اُردو کے روحِ رَواں گوپی چند نارنگ کیلئے ہے۔ کئی لوگوں کی ڈیوٹی، ہمیں ہمارے ہوٹل ''ہولی ڈے اِن'' میں پہنچانے کی ہے۔ کچھ رپورٹر ہماری طرح بھی آتے ہیں۔ ایک خاتون پوچھتی ہیں، ''آپ پہلی بار آئی ہیں؟ ابھی تو گھسی ہوں..... 'میں ڈوگری زبان کی شاعرہ ہوں، ہندی مصنفہ ہوں'۔ پاکستان آنے کا بہت اشتیاق تھا۔

ایک لمبا اونچا گورا سا لڑکا آ کر کہتا ہے، 'مجھے آپ کو ہوٹل لے جانا ہے'۔ تو

چلو، کہاں ہے تمہاری گاڑی؟' وہ اسٹیرنگ پر بیٹھ جاتا ہے۔ میں نے آگے اِسی کے ساتھ بیٹھتی ہوں۔ اتنا سُندر لڑکا دیکھ کر آنکھیں چوندھیا جاتی ہیں۔

'آنٹی آپ پہلی بار آئی ہیں نا؟ ہاں بیٹا! اِسی لئے میں لاہور کو دیکھوں گی نہیں، پیوں گی' 'آنٹی! میں آپ کو شہر دکھاتا ہُوا لے چلتا ہوں۔ گلبنگ بہت بڑھیا دکان ہے'..... راستہ دکھانے والا بیٹا آنٹی سے میل نہیں کھاتا۔ کتنا کچھ دے گئے ہیں انگریز ہمیں۔ اِس میں آنٹی بھی ہے نا؟! وہ مجھے ماں جی کہنے لگتا ہے۔ ابھی ابھی پیدا ہوئے میرے بیٹے کا نام منصور فیروز خان ہے۔ جیو میرے لال.....!

''ہالی ڈے اِن'' کافی عالیشان ہے۔ ایک طرف لمبا چوڑا سا ڈائننگ ہال ہے جہاں لاجواب کھانے ہیں۔ متعدد خدمتگار (بیرے) ہیں۔ لابی میں باقی لوگ بھی آ گئے ہیں۔ اَپنے اَپنے کمروں میں جا رہے ہیں، اِنہیں چھوڑنے آئے لڑکے منصور میاں کے دوست ہیں۔ ان میں ایک ایم پی ہے باقی زیادہ تر وکیل ہیں۔ سب ہی مجھے اُوپر چھوڑنے آئے ہیں۔ کمرہ بھر گیا ہے گپ بازی شروع ہو گئی ہے۔ گپ بازی میں یہ چھوکرے میرا کیا مقابلہ کرتے!

گپ بازی کے بیچ چائے بھی آ گئی ہے۔ اِس کا بھاری بھرکم بل منصور میاں نے اَدا کیا ہے۔ میں دیکھ رہی ہوں اِن لڑکوں کو کوئی فکر نہیں ہے۔ خوش باش اور بنداس! ابھی تک کسی کی شادی بھی نہیں ہوئی ہے۔ مالک اِن کو ہمیشہ خوش رکھے۔

اِن کے جانے کے بعد میں نے کھڑکی کے پَردے کھولے ہیں۔ سامنے ایک نہایت ہی شاندار بلڈنگ ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے خوب لمبی، چھریری وخوبصورت تاتاری باندیوں نے اِسے ہاتھوں پر اٹھا رکھا ہو۔ یہ کاری گری کا ایک عمدہ نمونہ ہے۔ پتہ چلا یہ بلڈنگ علامہ اقبال کی یاد میں بنائی گئی ہے۔ اقبال

صاحب! اَب بھی سارے جہاں سے اُچھا ہمارا ہندوستان ہی ہے۔

لڑکے چلے تو گئے ہیں مگر کمرہ ابھی ان کی خوشی و بے نیاز کی خوشبو سے بھرا ہوا ہے۔ میں اپنے ساتھ اُردو اور انگریزی کی کچھ کتابیں لائی تھیں وہ بانٹ دی ہیں۔ ہندی یہاں بہت کم لوگ پڑھتے ہیں یا شاید پڑھتے ہی نہیں۔

اگلے دن تین تاریخ کو لاہور میں بین الاقوامی کتابوں کے میلہ کا افتتاح ہے۔ پنجاب کے گورنر' لیفٹننٹ جنرل خالد محمود اِس کا افتتاح کرنے آئے ہیں۔ ہندوستان کے کئی چہرے یہاں چمک رہے ہیں۔ یہ چمک اَدیبوں کے لفظوں کی لڑیوں سے ملی ہوگی۔ خوشی ہوئی ہے۔ ہال کھچا کھچ بھرا ہے۔ ہم لوگوں کو بہت عزت واحترام سے بٹھایا گیا ہے۔ پروگرام بہت عمدہ ہے۔ اعزاز پانے والوں میں ہمارے نارنگ صاحب بھی ہیں۔ اِن کی بیوی منورما کا حسین چہرہ خوشی سے دمک رہا ہے۔ کتاب میلے میں ساہتیہ اکادمی کا بھی اسٹال ہے۔ اُردو کی کتابوں کی کتابت اتنی خوبصورت ہے کہ میں کسی پرانی لائبریری کو یاد کرنے لگی ہوں۔ جو کتابوں سے پیار کرتے ہیں۔ پہلا صفحہ یہاں تک کہ ٹائٹل بھی ان کے دل کا ارمان ہیں۔ میلہ بھر گیا ہے۔ حسین عورتیں، ماسٹرنیاں، طالب علم..... ماسٹرنیوں میں کئی سُندر کالے برقعوں میں ہیں۔ لڑکوں کی قطاریں لگی ہیں۔ ایک موٹی لڑکی جو شاید مانیٹر ہے، اس میں ماسٹرنیوں کے سارے گُن ہیں۔ میں سوچتی ہوں بڑی ہوکر یہ نامی ماسٹرنی ہوگی۔ میں تھک کر ایک اسٹال کے پاس کھلی جگہ میں پڑی کرسی پر بیٹھ کر تماشائے اہلِ کرم دیکھ رہی ہوں۔ تب ہی ساتھ والے اسٹال سے بڑے زور کے دھماکے کی آواز آئی ہے۔ پتہ چلا کوئی بڑا شیشہ ٹوٹ گیا ہے شکر ہے کسی کو چوٹ نہیں لگی۔ پر شیشہ بھی ٹوٹے اور کسی کو لگے بھی نہیں تو کیا فائدہ؟

ایک طرف ہر دلعزیز نامی شاعر احمد فراز لوگوں کے گھیرے میں اپنے سگریٹ کا دھواں اُڑا رہے ہیں۔ شیشہ ٹوٹنے کا شاید انہیں پتہ ہی نہیں چلا۔ شاعروں کو شیشہ ٹوٹنے کا پتہ چلتا بھی کہاں ہے؟!

اس کے بعد ہم پاکستان کے پریس کلب میں گئے ہیں۔ لوگ استقبال میں کھڑے ہیں۔ بڑا سا ہال..... ہم لوگ بیٹھ گئے ہیں۔ ابھی نارنگ صاحب نہیں آئے۔ تھوڑی گپ بھی چل رہی ہے۔ سب اُردو بول رہے ہیں۔ ایک آواز آئی اوئے یار پنجابی بول سچ بھی لگے (یار پنجابی بولو تا کہ سچ بھی لگے) بات فرید پر ہو رہی تھی۔ ایک آواز آئی بھئی، فرید کے کہنے اسے تو بٹوارہ بھی نہ مار سکا۔ ایک اور آواز، ادب میں تجربے ضروری ہیں۔ ادب زندگی کیلئے ہوتا ہے کوئی بھی بڑا ادیب اسٹیبلشمنٹ کا دُم چھلہ نہیں ہو سکتا۔ سب جگہ ترجمہ کا بڑا زور ہے۔ یہاں پاکستان میں ایک امن دستہ بھی ہے۔ جو امن تو چاہتا ہی ہے ساتھ میں یہ بھی کہتا ہے کہ ڈیفنس بجٹ کی جگہ کتابیں بانٹو۔ ایک امن فیسٹول بھی ہو رہا ہے۔ اب امن کی بات کھل کر ہونے لگی ہے۔

ایک خاتون نے پوچھا، پاکستان میں کیسا لگ رہا ہے۔ اُس نے مسکرا کر پوچھا تھا۔ میں نے ہنس کر جواب دیا، "یہ تو بالکل ہی نہیں لگ رہا کہ کسی دوسرے ملک میں آئے ہیں، یوں لگتا ہے جیسے ماں نے اپنی گود میں سے اُٹھا کر پڑوسن کی جھولی میں ڈال دیا ہو"۔

میں سوچتی ہوں ہم لوگ کس قدر جُڑے ہوئے تھے کہ بٹوارہ بھی ٹھیک نہ ہو سکا تھا۔ اِس بندر بانٹ میں بُری طرح بچھڑے، اب ملنے میں بھی مشکل نہ ہوگی۔ جب منصور نے مجھے ماں جی کہا تھا تب جیسے پاکستان بچے میں بدل گیا اور میں اسے آنگن میں کھیلتے ہوئے دیکھنے لگی۔

راستے سندر ہیں، درختوں پر کئی رنگوں کے پھول کھل کر بہار کے آنے کا ذکر چھیڑ رہے ہیں۔ شاید بہار آ چکی ہے۔ میرؔ کہتے ہیں۔

اے میرؔ عشق پہچاں اِک موج نظر آئی
شاید کہ بہار آئی ، زنجیر نظر آئی

سپت پرنی کے پھول اپنی مہک سے آس پاس کی مہک کو معطر کر رہے ہیں۔ لاہور مہک رہا ہے۔ لاہور کا ذکر میں نے سب پہلے اپنے چھوٹے بھائی کے پیدا ہونے پر سنا تھا۔ وہ ماشاءاللہ اگلے مہینے ریٹائیر ہو رہا ہے۔ چوزے جیسا تھا۔ عورتیں گا رہی تھیں۔

انکھے اٹھ سرگودیئے ،کیتے دیئے ڈالئے
انکھے لاہور دا کنگھیاں نولاؤں جسے نازاں آنکھ دیں

(کنتھ کی لاؤلی سر گوندھ کر بیٹھ جاؤ، نازوں کی پالی کہتی ہیں لاہور سے کنگھی منگوا دو تب کیش سنواروں گی)

آج ۴ر مارچ ہے۔ ایک چھوٹی بس میں سوار ہو کر ہم لاہور دیکھنے جا رہے ہیں۔ مال روڈ کناٹ پیلس کی طرح ہے۔ آگے لاہور ہائی کورٹ ہے، یہاں برسوں پہلے عصمت چغتائی اور سعادت حسن منٹو پر عریانیت کے الزام کا مقدمہ چلا تھا۔ عصمت آپا کا لحاف اور منٹو کی "بُو"۔ آپا کہتی تھیں ہائی کورٹ سے آ کر میں اور منٹو سیدھے انارکلی سے جوتے خریدنے گئے تھے۔ میں نے بھی ہنس کر کہا تھا، "اس کے بعد جوتے ہی خریدنے چاہئے تھے"۔

لاہور کا سب سے بڑا پوسٹ آفس پرانی انارکلی/نئی انارکلی، سڑک کے بیچ و بیچ کیا شاندار توپ تھی۔ ڈرائیور کہہ رہا تھا، مہاراجہ رنجیت سنگھ دشمن سے یہ توپ چھین کر لائے تھے۔ وارث شاہ کا مزار، خواجہ گیٹ اور اسلامیہ کالج۔ کالج میں بلراج

ساہنی اور دیو آنند یہیں پڑھے تھے۔ ڈی اے وی کالج لاہور میں میرے پتا جی پڑھے تھے۔ پرانا ہو گیا، اب وہاں کچھ اور بن رہا ہے۔ ڈرائیور نے ہی بتایا تھا۔ اصل میں ڈرائیور بڑا ہی دوست قسم کا پنجابی تھا۔ اس کی سارنگی بجتی ہی رہی۔ اس نے ایک کیسٹ بھی لگا دیا تو میں نے کہا، گانا سنوں یا لاہور دیکھوں، دونوں ہی سندر ہیں۔ اس نے تپاک سے کیسٹ بند کر دیا۔ پہلے ہی دن جب ہماری گورنر ہاؤس میں چائے کی دعوت تھی، تب گاڑی سے اُتری تو بولا، آیا یہ بلڈنگ، یہ باغ سب انگریزوں کے بنوائے ہوئے ہیں! واقعی عالیشان تھا گورنر ہاؤس، کھانے کے کیا کہنے، گوشت، گوشت اور بس گوشت! جہاں بھی تھوڑا گھاس پوس ہوتا وہ بکٹیرین اس پر پل پڑتے۔ ڈرائیور نے گاڑی آہستہ کی اور بولا۔ آپا حضرت داتا گنج بخش کی مزار دیکھیں۔ ابھی ادھر دیکھ ہی رہی تھی کہ پیچھے سے آواز آئی۔ لاہور، داتا کی نگری کہلاتا ہے۔ یہ جو اِتنے کتوبر ہیں، یہ فرشتے ہیں جو یہاں ہر وقت سایہ کئے رہتے ہیں۔ چوک داتا صاحب، سرکولر روڈ والڈ سٹی!

اب ہم بادشاہی مسجد دیکھنے جا رہے ہیں۔ ہر طرف سے پاکستان کا سمبل 'مینار پاکستان' دکھائی دے رہا ہے۔ یہ منٹو پارک میں ہے اور بہت ہی خوبصورت ہے۔ رنجیت سنگھ کی مڑی..... بڑا بڑا دالان، پُرسکون مقام، بیٹھ کر ستانے کا جی چاہ رہا تھا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کی سمادھی بہت ہی خوبصورت ہے۔ اس کے ساتھ ہی شاہی مسجد بھی ہے۔ جیسے چاندنی چوک میں مندر، مسجد، گوردوارہ سب ہی ہیں۔ وہاں پانچویں پادشاہی گوردوارہ میں، میں اور منور ما گئے۔ وہاں بھائی صاحب جی نے لنگر کھانے کی دعوت دی۔ پر چونکہ سب لوگ بس کی طرف جا رہے تھے، ہم نے پرشاد پر اکتفا کیا۔ بس کے باہر سب لوگ گاجر مولی کی چاٹ کھا رہے تھے۔ کمبخت

ہمیشہ ہی لذیذ ہوتی ہے۔ گوردوارجن سنگھ دیو جی کے گوردوارے میں گویا بذات خود گورو جی براجمان تھے۔ منور مامن کی بہت صاف اور سیدھی ہے۔ وہ تو روحانی طور پر مست ہوگئیں۔ انہیں دیکھ کر میں نے سوچا، کیسے کیسے عالم لوگوں کو کیسی اچھی بیویاں مل جاتی ہیں۔ نارنگ صاحب خوش قسمت تو ہیں ہی، کوئی شک؟ 'لو' کے نام پر بنایہ لاہور..... اوپر سے دیوانِ عام..... خوب تانتا بندھا رہتا ہے۔ بادشاہ کے تخت پر کبھی مکھی بھی سوچ کر جاتی ہوگی۔ آج مچھر تڑاتڑ تصویریں کھنچوا رہے ہیں۔ قلعہ میں بادشاہ کی پانچ خواب گاہیں ہیں۔ میں سوچتی ہوں۔ آج بادشاہ کونسی خواب گاہ چنیں گے؟ بارہ دری میں بارش دیکھنے کیلئے ایک باغ ہے۔ بھئی! مزے تو لے گئے بادشاہ! شیش محل میں کام ہو رہا ہے۔ کچھ لڑکیاں بھی پینٹنگ کر رہی ہیں۔ بڑے میاں، نقص نکال رہے ہیں۔ اس کے بعد ہم بادشاہی مسجد میں گئے۔ نماز کا وقت تھا، اذان ہوئی اور لوگ سربسجود ہو گئے۔

ہمارے میزبانوں میں ایک صاحب کی سسرال جموں میں ہے۔ ان کا نام ہے اعجاز احمد آزر۔ میں نے چھیڑا۔ میاں جموں میں سسرال ہے، میری تو یہیں لاہور میں ہے کشن نگر، چوک فاطمہ! آزر خوش ہو کر بولے تو آپا برابر ہوگئی۔

واپسی پر بائیں طرف ایک شاہی محلہ بنایا گیا ہے۔ جہاں طوائفیں رہتی ہیں۔ آزر کہنے لگے میری نظم کی چند لائنیں سنئے..... ارشاد

برکت سے پرے ترا وہ بازار سجا ہے
افلاس جہاں کوڑیوں کے مول بکا ہے
بیٹھی ہے دریچے میں اک حوا کی بیٹی
تذلیل پہ مجبور ہے تقدیر کی ہیٹی

مسجد کے سائے میں یہ خرافات کا منظر
بھرپور طمانچہ ہے یہ تہذیب کے منہ پر
زرداری کے کاندھے پہ یہ افلاس کا توشہ
آ، دیکھ اے اقبال غریبوں کا تماشا!

لاہور کی انارکلی اور دہلی کا چاندنی چوک شاید عاشق و معشوق ہیں۔ دونوں شاید ایک ہی سانس لیتے ہیں۔ میں، منورما اور ڈرائیور انارکلی گئے۔ بھری بھری انارکلی دیکھ کر ٹرک پر لکھا ایک جملہ یاد آیا۔ 'انارکلی، بھر کے چلی'۔ خوب بھری بھری تھی انارکلی۔ وہاں ہم نے کچھ دوپٹے، کچھ جوتے، سرمہ، کڑھائی کا سامان اور میں نے اپنی بیٹی کے لئے ایک خوبصورت انگوٹھی خریدی۔ منورما کی خریداری زیادہ تر اپنی بہو کیلئے تھی۔ بہو اور بیٹی میں آجکل کوئی فرق نہیں!

ایک دکاندار نے لاجواب چاٹ کھلائی۔ ہمارا ڈرائیور بھی ساتھ تھا۔ چاٹ کھاتا سی.....سی، کر رہا تھا۔ میں نے سرینگر میں اپنی بہنوں کیلئے نماز پڑھنے کیلئے دوپٹے خریدیئے۔ دکاندار کچھ حیران تھا۔ اس کی حیرانگی بڑھانے کیلئے میں بڑی عاجزی سے ایک شعر پڑھا ؎

دَرِ حبیب بھی ہے، بُت کدہ بھی، کعبہ بھی
یہ دیکھنا ہے سکوں اَب کہاں سے ملتا ہے

وہ حیران ہو کر مجھے دیکھ رہا تھا۔

شام کو ٹاؤن ہال میں سیمینار تھا۔ پورا ہال بھرا ہوا تھا۔ مجھے بولنے کا موقعہ ملا تو میں نے کہا میں جب سے یہاں آئی ہوں، یہ پتہ نہیں چل رہا کہ میں میکے میں ہوں یا سسرال میں۔ کیونکہ یہ شہر میرے سسرالیوں کا ہے۔ تو محبت اور خاطر داری میں کوئی کمی محسوس نہیں ہوئی۔ میکہ جیسا حق اور اپنا پن لئے کئی بھائی بھی میدان میں

ہیں۔لوگ کافی جذباتی ہو گئے تھے۔چائے بھی زوردار تھی۔

اس رات بہت ہی انوکھا ڈنر ہوا۔نہ پہلے دیکھا، نہ سنا۔لاہور کا گول منڈی بازار۔آس پاس کھانے کی دکانیں، بیچ میں چوڑی سڑک پر میز کرسیاں! ہزار کے قریب تو لوگ ہوں گے ہی۔سو کے لگ بھگ تو ہم لوگ ہی تھے۔ساری دکانوں پر لذیذ کھانوں کی پلیٹیں اٹھ رہی تھیں۔ہماری میز طرح طرح کے گوشت سے بھر گئی تھی۔کھائے جاؤ.....کھائے جاؤ۔گھر بھی اپنا، پیٹ بھی اپنا۔بازار کے سرے پر پان والا بھی تھا۔دکانوں کی چھتوں پر حویلی نما بند کھڑکیوں کی جھریوں سے کیا کوئی جھانک رہا ہوگا؟ کچھ پتہ نہ چل پایا۔فرنی کی ایک پر دوسری مٹی کی طشتری کو "دگی" کہا جاتا ہے۔دگی پھینکو، دنادن فرنی آ رہی تھی۔کھانے کے بعد پان والے کے پاس بھی کئی لوگ گئے۔ایک نے کہا پان آپ کا، مسالہ ہمارا۔میں نے کہا، پان بھی آپ ہی کے ہیں۔ایک طرف اونچے لمبے میراثی لڑکے ثنائن ڈھولک پر گا رہے تھے۔آوازیں آسمان کو چھوتیں، پر قدرے بے سُرے۔گائیک پتی کی پتنی ہونے میں کم جو کھم نہیں ہے۔پر کیا آوازیں تھیں لڑکوں کی۔ماہی وے، ماہی، مے کو چھلا پوا دے، کھچ میری فوٹو وچ بٹوے میں لا دے (ماہی رے ماہی مجھے چھلا پہنا دے۔میری فوٹو کھینچ کر اپنے بٹوے میں لگا لو)

وہیں ایک لڑکے نے میری بندی کی طرف اشارہ کر کے کہا کیا یہ بہت مہنگی ہوتی ہے۔میں نے کہا نہیں۔تمہیں چاہئے کیا؟ وہ شرما کر چلا گیا۔میں نے سوچا اس نے میر کا یہ شعر کہا سنا ہوگا۔

لڑکے برہمنوں کے ہندوستان میں دیکھے
صندل بھری جبیں ہے ہونٹوں پہ لالیاں ہیں

پتہ نہیں اَب وہ لڑکے کہاں ہیں۔ گوال منڈی میں ایک لاہورن آپا یوں گلے لگ کر روئیں جیسے سسرال آنے کے وقت کوئی سہیلی گلے لگ کر روتی ہے۔ انہوں نے کہا تھا یہ دونوں ملک ہماری زندگی میں ہی مل جاتیں تو کتنا اچھا ہو۔ یہ دکھ ایک بہن بیٹی کا تھا۔ اور ایک ماں کا بھی۔ جس کے کتنے ہی بیٹے اس مارا ماری میں چلے گئے۔ یہ کون بتائے کہ ماں صرف ماں ہوتی ہے۔ وہ پاکستان اور ہندوستان نہیں ہوتی۔ ماں جیسے بہار کا موسم ہے جو دونوں ملکوں پر یکساں ہوتا ہے۔ پر، ماں کی کون سنتا ہے۔ گوال منڈی میں کھانے تو ہر طرح کے ہیں پر، فجے کے پائے کے کیا کہنے۔ فجے کا نام تو فضل حق ہے، پر یہاں وہ صرف فجا ہے۔ لاہور میں روز ہی کھانا ہوتا رہا۔ ایک دن دوپہر کا کھانا۔ ''وتیج ریستوران'' میں تھا۔ اندر جاتے ہی لگا جیسے کسی دوسری دکان میں آ گئے ہیں۔ بڑی آؤ بھگت! طرح طرح کے کھانے..... صرف کشمیری وازوان سے کم پڑتے ہیں۔ میں نے ایک دو چیزیں لیں اور مکئی کی روٹی کو توڑنے لگی۔ ساتھ میں بیٹھی ایک لڑکی ہنس ہنس کر قربان ہوتی جاتی تھی۔ مصنفہ، صحافی کے علاوہ بھی کچھ تھی۔ بڑی پیاری سی شخصیت۔ ساڑھی پہنتی تھی۔ ویسے پاکستان میں کئی عورتیں ساڑھی پہنتی ہیں۔ اس نے ٹاؤن ہال میں مجھے سنا تھا۔ کہنے لگی بتائیے ڈوگری کیسی ہوتی ہے؟ میں نے کہا بالکل میری جیسی..... جیسی ماں، ویسی بیٹی! اس کے اصرار پر میں نے اسے ڈوگری کی ایک رباعی سنائی..... پہلے کلاڑی کے معنی سمجھائے۔ وہ دھیان سے سُن رہی تھی۔ ہمارے یہاں گوجروں کے گھر جب پہاڑ پر بستے ہیں تو دودھ دہی بہت زیادہ ہوتا ہے۔ دودھ دہی کو اُبال کر پانی مویشیوں کو پلا دیا جاتا ہے۔ اور بچے ہوئے پنیر سے گول گول آٹے کے پیڑے جیسے بنا کر سکھا لئے جاتے ہیں۔ پھر کوئی نیچے سامان لینے

جاتا ہے تو انہیں بیچ بھی آتا ہے۔ انہیں کلاڑیاں کہتے ہیں۔ ڈوگرے کلاڑیوں کے بہت شوقین ہوتے ہیں۔ انہیں دھیمی آنچ پر توے پر رکھ کر بھونتے ہیں۔ ان میں سے گھی بھی نکلتا ہے اور پھر سنکی ہوئی کلاڑی پر نمک چھڑک کر، کون کھائے اور کون چھوڑے؟ خیر یہ تو ہوا تعارف۔ اَب سُنو رباعی ۔

آؤں کھمائی اے شوالک پہاڑیاں
مہالا دیانت نمیا لاڑیاں
ان دیئے تے چہ بیٹی گجری کوئی
گوجر نے تلادی کلاڑیاں

(میں اپنی شوالک پہاڑیاں پر قربان جاؤں، یہ ہمالیہ کی نت نئی محبوبائیں ہیں۔ ان کی تہوں میں بیٹھ کر کوئی گوجری اپنے گوجر کیلئے کلاڑیاں تل رہی ہے)

وہ لڑکی دوسرے دن جب کھانے پر ملی تو کہنے لگی۔ آیا! آپ کی رباعی میری روح میں ہے اور اب تک آدھے لاہور کے دل میں ہے۔ پاس کی میز پر کوئی کہہ رہا تھا۔ یار بچپن میں گھر کی منڈیر پر کبوتروں کا جوڑا دکھائی دیتا تھا اور یقین جانئے ان کبوتروں کو دیکھ دیکھ کر ہم جوان ہوئے ہیں۔ ہم دونوں بھی ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرا اٹھیں۔

رات کے کھانوں میں ایک مزیدار بات تھی۔ ایک وائلن نواز ہر ٹیبل کے پاس جا کر وائلن بجاتا۔ وائلن پر اکثر لتا منگیشکر کے گیت بجتے۔ لوگ اپنے ماضی کے سُروں میں کھو جاتے۔ دیدی کے گیت جیسے ماضی کی کتاب کے پھڑکتے ورق!

بڑے ارمان سے رکھا ہے صنم تیری قسم
پیار کی دنیا میں یہ پہلا قدم
۔میرا لال دوپٹہ ململ کا

آجا صنم مدھر چاندنی میں ہم
ساون کا مہینہ پون کرے سور

لوگ جھومتے رہے۔ ایک نے وائلن نواز سے کہا۔ یار کچھ اپنا بھی ہے یا نہیں، کچھ اپنا بجاؤ، وائلن نواز نے بجایا۔

چاندنی راتیں سب جگ سوئے، ہم جاگیں تاروں سے کریں باتیں
چاندنی راتیں.....

میں مسکرائی کیا یہ گیت ان کا ہے.....؟ یہ تو ہم سب کا ہے۔ جیسے ہوا کو کوئی نہیں بانٹ سکتا ویسے ہی گیتوں کو کوئی نہیں بانٹ سکتا.....!

جس دن ہمیں اسلام آباد جانا تھا اس دن صبح پانچ بجے کمرے کے پردے کھولے تو شو کے ماتھے پر سونے جیسا چاند دکھائی دیا، جیسے ہنسی ہو۔ میں نے سوچا آج شو راتری ہے۔ شو کو دیکھ لیا۔ گھر میں میرے پتی میرے شو جی پر ضرور بیل پتر چڑھا دیں گے۔ سات بجے کا جہاز تھا۔ میں نے دیکھا جہاز کے پہیئے سیٹ سے دکھائی دے رہے تھے۔ پہیہ گرا، چلا، پھر اپنے خول میں سما گیا۔ اسلام آباد پہنچنے پر ہوائی اڈے سے شہر کا راستہ بے حد خوبصورت ہے۔ سندر راستے میں فاطمہ جناح پارک، جناح ایونیو، پارک سکریٹریٹ اور درخت۔ جن میں چیڑ کے درخت بھی تھے اور ٹالی کے بھی۔ پنجابی کا ایک گیت ہے۔

ٹالی دے اور ہلے بیٹھ کے اوبھیہ کے او ماہیا
آکر ئیے دل دیاں گلاں

(ٹالی پیڑ کی اوٹ میں بیٹھ کر او میرے ماہی آ دل کی باتیں کریں)

اسلام آباد میں اردو کی بین الاقوامی کانفرنس کی وجہ سے جگہ کی تنگی تھی۔ سارے ہوٹل بھرے ہوئے تھے۔ احمد فراز صاحب نے کچھ لوگوں کو پوسٹ آفس

کے گیسٹ ہاؤس میں ٹھہرا رکھا تھا جس کی منڈیروں پر چیڑ کے درخت کھلے ہوئے تھے۔ان پر بلبلیں نغمہ سرا تھیں۔ میں بھی یہیں تھی۔

شام ہونے میں کافی وقت تھا۔ میں نے سوچا پتی دیو کو فون کرنا چاہئے۔ گیسٹ ہاؤس کے چوکیدار نے کہا۔ ''سڑک ختم ہوتے ہی دائیں مڑیں سامنے پی سی او ہے''۔ وہاں پہنچ کر میں نے لاہور میں منصور کو فون کیا تو لگ گیا۔ مگر ہندوستان میں کوئی فون نہیں لگ رہا تھا۔ تھوڑی دیر میں باہر جھانکا۔ قدرے دھندلکا ہو رہا تھا۔ میں نے سوچا شام ہونے سے پہلے یہاں سے چل دینا چاہئے۔ مجھے تو جلدی تھی ہی۔ شاید شام کو بھی جلدی تھی۔ جب میں موڑ کے بعد گلی میں پہنچی تو وہ گلی نہ تھی۔ میں نے سوچا پہلی گلی سے نکل لیتی ہوں۔ سڑک پر چل رہی تھی۔ گیسٹ ہاؤس کہیں سے بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اب میں مڑی سڑک پر پہنچ کر چلنے لگی۔ گیسٹ ہاؤس نہ ادھر نہ ادھر۔ پتہ نہیں کہاں غائب ہو گیا۔ یاد آیا ماں کہتی تھیں، تیری چمڑی میں ڈر نہیں ہے۔ میں نے شوجی کو بھی یاد نہیں کیا۔ بس گھر ڈھونڈے جا رہی تھی۔ میں نے دیکھا سب میری بندی کو دیکھ رہے ہیں۔ چال ڈھال بھی ہندوستانی تھی۔ میں نے بندی اتار کر ہتھیلی پر چپکالی۔ بڑا شاندار علاقہ تھا۔ بھگوان کے کرم سے اتنا یاد تھا کہ ڈاک گھر کے گیسٹ ہاؤس میں ٹھہری ہوں۔ جس چوکیدار سے پوچھوں، وہ کہے ہمیں پتہ نہیں۔ گھبرا گئی تھی۔ دیکھا کہ ایک بڑا مہذب سا جوڑا سیر کرنے نکلا ہے۔ میں نے نہایت عاجزی سے کہا، میں ہندوستان سے آئی ہوں، پوسٹ آفس کے ڈاک بنگلے میں ٹھہری ہوں، اپنے میاں کو فون کرنے گئی تھی۔ اب گیسٹ ہاؤس نہیں مل رہا۔ وہ لوگ بولے چلئے ہم آپ کو چھوڑ آتے ہیں۔ وہ صاحب پوسٹ آفس میں ملازمت کر چکے تھے۔ دونوں جب چھوڑنے آئے تو

گیسٹ ہاؤس کے گیٹ پر سب کھڑے تھے۔ میں نے اُن دونوں کا شکریہ ادا کیا ورجان بچی سولاکھوں پانے کے انداز میں بولی، میں سچ میں ڈر گئی تھی۔ اَب پتی دیو کو قصہ سُنا سکتی ہوں مگر یقین جانئے آج بھی یاد کر کے ڈر لگتا ہے۔

اِسی شام فراز بھائی نے ایک ہوٹل میں دعوت دی تھی۔ اگلے روز صبح ہم تکشلا کا میوزیم دیکھنے جانے والے تھے۔ اس میوزیم کے کیا کہنے! پاکستان نے ہر چیز کو بہت حفاظت سے رکھا ہوا ہے۔ وہاں اسکولوں کی لڑکیاں بھی آئی ہوئی تھیں۔ میری بندی اور ساڑھی دیکھ کر سب نے میرے ساتھ فوٹو کھنچوایا۔ اگلے دن تکشلا کا عجائب گھر دیکھنے ہم جا رہے تھے۔ ڈرائیور وقار خان کی گاڑی فراٹے بھرتی، پرتولتی، خوبصورت سڑک پر ایک طرحدار عورت کی طرح بھاگ رہی تھی۔ کہیں کہیں پہاڑیاں دکھائی دیتیں ان پر کوئی درگاہ یا عبادت گھر..... تکشلا میں پاکستان سرکار نے بودھ کے زمانے کی کھدائی میں نکلی اشیائے کو بڑے قرینے اور احتیاط سے سنبھال کر رکھا ہے۔ کئی لوگ اسکول کے بچے، وہاں موجود تھے۔ تکشلا میوزیم دیکھنا ماضی کے کنوئیں میں ڈُوب کر آنے جیسا ہے۔ بہت اچھا لگا۔

شام کو اسلام آباد کے ایک بازار میں تھالی جتنی بڑی جلیبیاں بِک رہی تھیں۔ ہم سب نے گرما گرم جلیبیاں کھائیں اور بازار میں خشک میووں کی دکانوں سے خریداری کی۔

اردو کی بین الاقوامی کانفرنس میں پوری دنیا کے نمائندے شامل تھے۔ جب فرانس، چین، جاپان اور دوسرے کئی ملکوں کے لوگوں نے اردو میں تقریریں کیں تو مزہ آ گیا۔ جاپان کے ایک مقرر نے کہا، لوگ پوچھتے ہیں۔ جاپان کی ترقی کا راز کیا ہے؟ تو میں کہتا ہوں کہ ہم اپنی زبان میں پڑھتے لکھتے ہیں۔ کتنی سچ بات ہے، پر لوگوں کی سمجھ میں کب آئیگی؟

ہمارے نارنگ صاحب نے اردو میں تقریر کر کے سماں باندھ دیا۔ ان کی علمیت و ذہانت یہاں ہر روز چار چاند لگاتی رہی۔ میں اکبر کا یہ مصرعہ بار بار یاد کرتی ہوں۔

آنکھیں میری، باقی ان کا

پاکستان کی سرزمین پر اردو، اردو ہی رہی ہے ایک مصرعہ ہوا۔

تم میری یادوں میں کھیلو، میں تیرے سپنوں میں جاگوں

گیت کا مکھڑا تو ہو ہی گیا۔ سنو مائیں کیا کہہ رہی ہیں۔ ہم جوانی میں اپنے بچے گنوا کر بہت دکھی ہیں اب ہم بچے پیدا نہیں کریں گے۔

۱۹۴۷ء میں جو عورت لاہور کے ریلوے اسٹیشن پر اپنے نو بچوں کو لے کر دلی آئی تھی وہ میری ساس تھیں۔ میرے سُسر یہ ماننے کو تیار نہیں تھے کہ لاہور میں ان کا رہنا ناممکن ہوگا۔ بعد میں وہ بھی آ گئے تھے۔ دلی میں رہ کر بھی وہ لاہور جاتے رہے۔ اگر آج بھی تیرا، میرا..... 'ہمارا' ہو جائے تو کتنا اچھا ہو۔ دونوں ملکوں کے عوام تو یہی چاہتے ہیں اور عوام کی آواز کو دبانا مشکل ہے۔

ہمارا سب ہی کچھ تو سانجھا ہے۔ کیا امریتا پریتم، آپ کی نہیں یا فیض احمد فیض ہمارے نہیں ہیں۔ میر، مومن و غالب کس کے حصے میں آئے پتہ نہیں۔ اور اقبال، وہ تو اپنے فلسفہ کو لے کر آج بھی ہمارے ساتھ ہیں۔ ہمارے قومی کوی 'دنکر' اقبال کی ہندی میں چھپی شاعری کی کتاب میری کتابوں میں سے چن کر بولے "ہم لے جا رہے ہیں' اور وہ لے گئے۔ مگر اقبال کا آشیرواد ہم سے کون لے سکتا ہے۔ بڑے میاں! آج بھی آپ کا یہ شعر اتنا ہی سچ ہے جتنا اس وقت تھا جب آپ کی قلم سے نکلا تھا۔

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا

ہم بُلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا

بے ہمہ و با ہمہ

تازہ خواہی داشتن گر زخمہائے سینہ را
گاہے گاہے باز خواں ایں قصۂ پارینہ را

بہت دنوں تک وہ اہم نجی مکتوبات میرے پاس محفوظ تھے جو میرے برادر[1] مکرّم سابق وزیر اعلیٰ ریاست جموں و کشمیر سید میر قاسم صاحب نے میرے ذاتی نوعیت کے خطوط کے جواب میں بڑی محبّت سے تحریر فرمائے تھے، جب وہ ۶۲۔۱۹۶۱ء کے آس پاس، خالد کشمیر مرحوم بخشی غلام محمد وزیر اعظم جموں و کشمیر کی وزارت میں کابینہ درجے کے وزیر تھے۔ اِن شفقت بھرے مکتوبات میں انہوں نے اور باتوں کے علاوہ شکایات کا اُزالہ کرتے ہوئے یہ بھی لکھا تھا کہ 'آپ نے خطوط کیا لکھے ہیں بلکہ خوب شاعری کی ہے، کاش آپ مسائل کا حل بھی بتاتے'۔

مجھے افسوس ہے کہ قاسم صاحب کے وہ بے ساختہ نوعیت کے خطوط امتدادِ زمانہ سے تلف ہوئے حالانکہ میرے پاس اُس سے پہلے کی اہم اور غیر اہم دستاویزات موجود ہیں۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ یہی کام کی چیز گم ہو جائے گی اور میں خود ہی اُپنے ضمیر کے کٹہرے میں اقرارِ جرم کرنے کیلئے ایک دن کھڑا ہو جاؤں گا۔

---

[1] ..... سید میر قاسم صاحب رشتہ میں راقم الحروف کے پھپھیرے بھائی تھے۔

بقول فیض احمد فیض

وہ بات کہ سارے فسانے میں جس کا ذکر نہ تھا
وہ بات اُن کو بہت ناگوار گزری ہے

خداوندِ لم یزل نے مجھے بڑی بلکہ بے شمار عنایات سے نوازا لیکن مکانیت کے ضمن میں مجھے ایک نہ ایک رنگ میں محتاج ہی رکھا۔

جائے تنگِ ست، مرد ماں بسیار
وقتار بنا عذاب النار

نتیجہ یہ کہ خانہ بدوش کرایہ دار کی حیثیت سے میں یہ چند ایک آبدار تخلیقی جواہر پارے بھی گنوانے کے اذیت ناک مراحل گزارنے کا گنہگار بھی ہوا اور آج میں ایک عجیب ہی احساسِ ندامت سے دوچار ہوں۔ قاسم صاحب بھی اس بارے میں مسلسل التجاؤں کے باوصف میری کوئی مدد نہ کر سکے کیونکہ۔

بندگی میں بھی وہ خود بین و خوددار ہیں کہ ہم
لوٹ آئے گر درِ کعبہ وا نہ ہوا

میں اُن دنوں ویٹرنری سٹاک اسسٹنٹ کی حیثیت سے اپنے فرائضِ منصبی انجام دے رہا تھا۔ اپنی افتادِ طبع کی بناء پر میں چاہتا تھا کہ میں محکمہ ویٹرنری چھوڑ کر محکمہ تعلیم میں آجاؤں جو اُن دنوں بہت ہی معمولی بات تھی۔ قاسم صاحب اِس اہم معمولی امر کی جانب مطلوبہ توجہ نہ دے سکے۔ شاید اس لئے کہ 'امورِ مملکت خسرواں دانند' یا اس وجہ سے کہ وہ بھی اقرباء پروری کی عمومی گرفت میں نہ آجائیں۔ اسکا ثمر خوش آئندہ میرے نصیب یہ ہوا کہ میں وسیع تر مطالعہ کتب کے ساتھ ساتھ نصابی مطالعہ میں بھی جُٹ گیا اور دیکھتے دیکھتے پرائیوٹ گریجویٹ ہوا کشمیر یونیورسٹی کا۔

جسکی بناء پر ۱۹۶۷ء میں میرا ریاستی کلچرل اکادمی میں سینئر لٹریری اسسٹنٹ کی حیثیت سے باضابطہ انتخاب کے بعد تقرر ہوا۔ وہی کچھ ہوا جو میں چاہتا تھا۔ وہی کچھ ملا جسکی مجھے تلاش تھی۔ جام چاہا اور خُم ملا۔ الفاظ کی پُراسرار و پُرمعانی نگری کا۔ اکادمی میں آنے کے بعد ہی میں نے کشمیر یونیورسٹی سے فارسی میں ایم اے کیا جس کیلئے مجھے یونیورسٹی کیلنڈر چینج کرانا پڑا۔ پروفیسر سیف الدین سوزؔ جو اُن دِنوں یونیورسٹی کے رجسٹرار تھے، اس ضمن میں اُپنا پُرخلوص دستِ تعاون دینے میں پیش پیش رہے جس کیلئے میں اُن کا شکر گذار ہوں۔ میں نے اُپنے من میں یہ بات ٹھان لی تھی کہ اَب کے بعد کسی کا احسان نہیں اٹھاؤں گا لیکن تقدیر کا کیا کیجئے جو ہمیشہ خندہ زن رہا کرتی ہے۔ ریاستی کلچرل اکیڈیمی میں اسسٹنٹ ایڈیٹروں کی دو اَسامیاں خالی تھیں۔ محکمانہ دو اُمیدواروں میرے اور بدری ناتھ کلا کے ساتھ ساتھ باہر کے امیدواروں کا بھی باضابطہ انٹرویو ہوا۔ ماہرین کی نظر میں کوئی بھی امیدوار موزوں نہ پایا گیا۔ یہ ہمارے لئے ایک چیلنج تھا جو میں نے قبول کیا۔ میں درخواست دائر کردی کہ محکمانہ حقدار کو حق ملے۔ جناب غلام محی الدین مام محکمہ تعلیم کے سیکرٹری ہونے کی بناء پر اکادمی کے سیکرٹری بھی تھے۔ انہوں نے اکادمی کے صدر جناب سید میر قاسم صاحب کو یاداشت بھیج دیا اور خالی اَسامیوں پر میرے اور ڈاکٹر بدری ناتھ کلا کے محکمانہ تقرر کی سفارش کی۔ مرحوم علی محمد لون اکادمی کے اُس وقت کے بااختیار ڈپٹی سیکرٹری نہ ہوتے تو یہ معاملہ دفتری طوالت کے سرد خانے کی بھینٹ چڑھ جاتا۔ لون صاحب نے قاسم صاحب کے میرے خونی رشتہ کے پیش نظر ان سے بھی ملنے کا نیک مشورہ دیا۔ میں نے ایسا ہی کیا۔ قاسم صاحب نے یقین دلایا کہ معاملہ اکادمی کا سیکرٹریٹ کی سفارشات کے مطابق ہی طے ہوگا۔

تقریباً دو ڈھائی ماہ کا عرصہ گزر گیا۔ جناب صدر کی مطلوبہ منظوری کہیں آتے دکھائی نہ دی۔ لون صاحب یہاں تک کہہ اُٹھے کہ یہ کون سا خونی رشتہ ہوا جو ایک سیدھا سا محکمانہ تقرری کا مسئلہ بھی نہ سُلجھا سکے۔ بعد میں پتہ چلا کہ کشمیری زبان کے معروف شاعر، محقق، نقاد اور کشمیر شناس آنجہانی موتی لال ساقی بھی کہیں سے مقابلہ میں اُترے تھے۔ بہر حال جُوں تُوں کر کے معاملہ سلجھ گیا۔ میں اور ڈاکٹر بدری ناتھ کلاخدا خُدا کر کے اسسٹنٹ ایڈیٹر ہوئے۔ ساتھ ہی سور گباشی موتی لال ساقی بھی ریڈیو کشمیر سے ریسرچ اسسٹنٹ کی حیثیت سے اکادمی میں آئے۔ وہ بھی جب قاسم صاحب نے اِس اَمر کی پوری جانچ کی کہ میرے ممیرے بھائی کی محکمانہ ترقی میں کسی بھی طرح کی نامناسبت، فرقہ واریت یا اقرباء پروری کا شائبہ تو نہیں۔ یہ اُن دنوں کی بات ہے جب جناب سید میر قاسم وزیر اعلیٰ کے اعلیٰ منصب پر فائز ہونے کے ناطے ۱۹۷۲ء میں اکادمی کے صدرِ محترم بھی تھے۔

یہ روئیداد زمانہ ہے کوئی رام کہانی نہیں۔ قاسم صاحب کی بات ہے میرا اپنا دُکھڑا نہیں۔ سور گباشی موتی لال ساقی نے شائد اِس لئے کشمیری زبان کے اپنے تذکرے 'گاشِری ۱۹۷۴ء' کا انتساب احتراماً یوں کیا ہے: 'جناب سیّد میر قاسم صاحب کے نام جنہوں نے تحت الرّجال کے اُس دَور میں میرے زخموں پر پھاہا رکھا'۔ میں ذاتی طور کبھی بھی کسبِ منفعت کیلئے قاسم صاحب کی خاص توجہ کا مرکز نہ بنا لیکن مجھے اس بات کا اعتراف کرتے ہوئے مسرّت ہو رہی ہے کہ اپنی صالح اَولاد کی شادی بیاہ کی تقاریبِ مسعود پر ہر دو برادرانِ گرامی جناب میر سیّد حسین صاحب اور جناب سیّد میر قاسم صاحب نے ہمیں ہمیشہ یاد کیا چاہے صلائے عام تھی یا دعوت خواص۔

زندگی کی اوج گاہوں سے اُتر آتے ہیں ہم
صحبتِ مادر میں طفل سادہ رہ جاتے ہیں

وہ اس لئے کہ ان کی نظر ریاست کے سبھی عوام پر تھی اور میں بہر نوع ایک اَدنیٰ فرد تھا۔ قاسم صاحب نے اعلیٰ سیاسی قدروں کو اقتدار پر ترجیح دی۔ جمہوریت اور جمہوری قدروں پر اُنکا راسخ عقیدہ ہے۔ نیشنل کانفرنس ہو، ڈیموکریٹک نیشنل کانفرنس یا انڈین نیشنل کانگریس انہوں نے ناقابلِ عمل غلط فرقہ واریت اور ناعاقبت اَندیشانہ موقعہ پرستی پر مبنی سیاست سے کبھی سمجھوتہ نہیں کیا۔ یو این او اسمبلی تھی، ہندوستانی پارلیمنٹ یا ریاستی عوام کا اجتماع حق گوئی انکا شیوہ رہا جس کا دامن انہوں نے کبھی نہیں چھوڑا۔ امن وآشتی انکی زندگی کا نصب العین رہا جس کی جانب وہ ہمیشہ ثابت قدم رہے۔

خواجہ غلام محمد صادق مرحوم کی وفات پر ریاست جموں وکشمیر کے وزیر اعلیٰ کا منصب ۱۹۷۱ء میں سنبھالنے سے بہت پہلے بھی میں نے انہیں کئی بار بَرملا کہتے ہوئے سنا کہ شیر کشمیر شیخ محمد عبداللہ جیسے بلند قامت اور ہر دلعزیز عوامی رہنما کو جیل کی سلاخوں کے پیچھے رکھ کر ریاست کی سرکار چلانا جمہوری قدروں کے منافی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ریاست کے اقتدارِ اعلیٰ پر فائز ہوتے ہی اُنہوں نے اِس جانب پہل کی۔ انہیں ۱۹۷۱ء میں بنگلہ دیش کے وجود میں آنے کے بعد حالات کا صحیح ادراک تھا۔ شیر کشمیر شیخ محمد عبداللہ جو خواجہ غلام محمد صادق کے دَورِ اقتدار میں رہا ہو چکے تھے، بھی حالات کا جائزہ لے رہے تھے۔ انہوں نے محاذ رائے شماری توڑ کر یہاں کی نمائندہ علاقائی سیاسی پارٹی نیشنل کانفرنس کو اَز سرِ نو زندہ کیا۔ چنانچہ اندرا عبداللہ ایکارڑ ہوا اور فروری ۱۹۷۵ء میں بائیس سال کی طویل سیاسی عزلت کے بعد شیر

کشمیر دوبارہ برسرِ اقتدار آئے۔ اِس طرح سیّد میر قاسم صاحب نے ۱۹۷۵ء میں ہمیشہ کیلئے اقتدار سے کنارہ کشی اختیار کی۔ انہوں نے جمہوریت کی بقاء کیلئے اقتدار اعلیٰ کو چھوڑ کر ایک درخشندہ اور پائندہ روایت قائم کی۔ انکو جب ایسا لگا کہ کانگریس لیڈر مسلسل بدعہدی کا مرتکب ہو رہے ہیں تو انہوں نے کانگریس جیسی بڑی تنظیم کو بھی چھوڑ دیا۔ اِس بات میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں کہ اقتدار کی باعزت منتقلی میں اُنکا رول نہایت تعمیری اور کلیدی رہا۔ میں نے اقتدار سے الگ ہوتے وقت اُنکے رَویئے میں کوئی بوکھلاہٹ محسوس نہیں کی۔ اُن کے اِس اقدام کو بزدلی اور سیاسی عدم استقامت اور نااہلیت سے تعبیر کیا گیا لیکن وقت نے یہ بات ثابت کردی کہ انکا فیصلہ جذباتی نہیں بلکہ صحیح عقل وادراک پر مبنی تھا۔ جسے عملانے میں انکی سیاسی بالغ نظری اور وسعتِ قلبی کو بڑا دخل تھا۔ کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ ۔

ہر بوالہوس نے حُسن پرستی شعار کی
اَب آبروئے شیوۂ اہلِ نظر گئی

ستمبر ۱۹۸۲ء میں اپنی وفات سے پہلے شیر کشمیر شیخ محمد عبداللہ نے انہیں اقتدار اعلیٰ کی امانت واپس لوٹانے کی خواہش کا اظہار کیا لیکن قاسم صاحب نے اِسے اِس بناء پر قبول نہیں کیا کہ ایسا اقدام زندگی کے اصل اصول کے منافی ہوگا اور یہ کہ ۔

میر صاحب زمانہ نازک ہے
اَپنے ہاتھوں سے تھامئے دستار

قاسم صاحب کے سیاسی فیصلے بڑے دُوررس، دُوراندیش اور درَویشانہ فیصلے ثابت ہوئے ۔ دسمبر ۱۹۸۹ء سے جب سے یہاں مسلسل بدعہدی اور سیاسی ناعاقبت اندیشی کے نتیجہ میں مسلح جدوجہد شروع ہوئی قاسم صاحب سیاسی گوشہ نشینی

اختیار کر کے عملی سیاست سے دُور ہی رہے۔ انہوں نے زیادہ تر وقت دہلی میں ہی گزارا۔ ۲۰۰۱ء میں ریاستی سرکار نے انہیں چند ایک سہولیات کی تاحیات پیش کش کی تھی جن میں سے انہوں نے معمولی دفتری معاونت کے بغیر باقی سب کو اس لئے ٹھکرا دیا کہ آراستہ پیراستہ مکان، کار و فون وغیرہ کی دیگر سہولیات نجی طور اللہ کے فضل سے انہیں دستیاب ہیں۔ اِس لئے خزانہ عامرہ پر انکا بے جا اور بھاری بوجھ کیوں ڈالیں۔ قاسم صاحب نے بے اصول سیاست کو اپنا شعار نہیں بنایا۔ انکے سیاسی روئے انکی عملی زندگی اور سیاست انکی شرافت نفس، عالی نسبی اور عالی ظرفی کی غماز ہے۔ یہ سبھی خصائص آج کی سیاسی زندگی سے متضاد و مخالف ہیں کیونکہ آجکل سیاست اور جُرم کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ صفِ اوّل کے سیاستدان ہی مجرموں کی پشت پناہی کرتے ہیں بلکہ کئی صورتوں میں سزا یافتہ مجرم ہی قانون کے سازیہ کے معتبر قومی اور ریاستی ایوانوں تک پہنچنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔

بنے ہیں اہلِ ہوس مدّعی بھی، منصف بھی
کسے وکیل کریں، کس سے منصفی چاہیں!

اِن حوصلہ شکن اور صبر آزما حالات میں سیّد میر قاسم صاحب کی ذات گرامی آتش بارود م گھٹتے ماحول میں ٹھنڈے حیات آفرین ہوا کے جھونکے سے کم نہیں۔ انہوں نے بارہ سال خاموش رہنے کے بعد لب کھولے۔ وہ بھی جب انہیں ایسا لگا کہ اَب کشمیریوں کا لہو بہت بہہ چکا اور حالات کسی بہت بڑی لامحدود تباہی کی طرف بڑھ رہے ہیں اور ارضِ مالوف کہیں دیکھتے دیکھتے بھسم ہو کر نہ رہ جائے۔ انہیں ایسا لگا کہ ہندوستانی سیاست میں حالات کا نئے سرے سے جائزہ لینے کی جرأت اور تھوڑی سی لچک پیدا ہوگئی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ انہیں سیاسی فضا میں ہی

خوش آئند تبدیلی کا انتظار تھا۔ وہ سمندر کی طوفانی لہروں کا دُور سے نظارہ کرنے والوں میں شامل نہیں ہونا چاہتے تھے بلکہ اُن کا معاملہ آتشِ عشق میں بلا تامل کُود پڑنے کا ہے۔

بے خطر کُود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے تماشائے لب بام ابھی

بغور دیکھا جائے تو قاسم جسمانی اور طبعی طور عمر کی آخری حدود کو چھو رہے ہیں نقاہت کے باوصف ان کے مزاج کی لطافت و نفاست آج بھی برابر قائم ہے۔ وہ آج بھی طبعِ سلیم کے پیکر لگتے ہیں۔ نرم خُوئی اور دلجوئی انکی طبیعت کا خاصہ ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ سب سے اچھا آدمی وہی ہے جو لوگوں کی بھلائی کا کام کرے۔ انہیں مسلسل آرام و سکون چاہئے۔ موجودہ سیاست کے قومی اور بین الاقوامی گورکھ دھندے میں پھنسنا اُنکے بس کا روگ نہیں لیکن وہ جان و تن سے ریاست جموں و کشمیر میں امن و شانتی کا ماحول قائم کرنے میں جُٹ گئے ہیں۔ اللہ کرے کہ اُنکا یہ خواب بھی جیتے جی شرمندہ تعبیر ہو۔ وہ ذہنی طور پر چاق و چوبند ہیں۔ اُنکے چہرے بشرے پر یاسیت اور حزن کا کہیں نام نہیں۔ وہ نہایت ثابت قدمی سے اپنے عقیدے پر قائم ہیں کہ باہمی گفت و شنید کے ذریعہ ہی مسئلہ کشمیر کا کوئی قابل قبول حل نکالا جاسکتا ہے جس میں یہاں کے عوام کو امن کے ساتھ عزت و آبرو کی زندگی گزارنے کی ضمانت ملے۔ مسلسل سیاسی بدعہدی کا خاتمہ ہو کیونکہ بندوق کی نوک پر دیرینہ اُلجھے مسائل سلجھائے نہیں جاسکتے۔ اِس لئے وہ اِس بات پر زور دے رہے ہیں کہ ہندوستان و پاکستان کے باہمی قیام امن کیلئے گفت و شنید ہی واحد راستہ ہے۔ باجپائی، مشرف چوٹی کانفرنس جو ۱۴ر جولائی ۲۰۰۱ء کو آگرہ میں منعقد ہو رہی ہے کی کامیابی کے وہ ہمہ

تن متمنی ہیں۔ وہ خندہ پیشانی سے لوگوں سے ملتے ہیں اور جہاں ضرورت محسوس ہو اپنے دِل کی بات کہتے ہیں۔ وہ سردار جعفری کی زبانی جسے گویا ہوں کہ

ہم بھی مجبور ہیں، تم بھی مجبور ہو بہت
سلطنت اُپنی محبّت کے سِوا کچھ بھی نہیں!

شرط یہ ہے کہ سیاست کے شاطر محبت کی اِس سلطنت کی حدود کا ہر قیمت پر احترام کریں۔ صلحِ کُل قاسم کی زندگی کا نصب العین رہا ہے۔ اقتدار میں تھے یا اقتدار سے باہر، وہ غیر مرئی طور ہر مرحلہ پر اُسکے حصول کے کوشاں رہے۔ یہاں انہوں نے زندگی کا باہمہ و بے ہمہ والا اصول اپنا رہنما بنایا اور بلا کسی مخاصمت کے اِسکے پابند رہے۔

ہم سمندر باش و ہم ماہی کہ در اقلیمِ عشق
روئے دریا سلسبیل و قعرِ دریا آتش ست

قاسم صاحب کو روئے دریا پہ نہیں غالب کی طرح قعر دریا میں سکون ملا ورنہ وہ سیاسی سمندر کی طوفانی لہروں پر ثابت قدمی سے کھڑے ہو کر اَمن کیلئے صلائے عام دیتے ہوئے یہ نہیں کہتے کہ

ہم سمندر باش و ہم ماہی کہ در اقلیم عشق
قعر دریا یا سلسبیل و روئے دریا آتش است

پسِ نوشت:

کیا معلوم تھا کہ راقم الحروف کے یہ ناچیز تاثرات خراج تحسین کی بجائے خراج عقیدت کے طور ان کی وفات کے بعد تقریباً دو سال سے زائد عرصہ گزرنے پر شائع ہوں گے۔ ریاست جموں و کشمیر کے سابق وزیر اعلیٰ جناب سید میر قاسم ۱۲ر دسمبر ۲۰۰۴ء کو دہلی میں واصل بہ حق ہوئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ یہ

مختصر سا انشائیہ ان کی حیاتی میں ہی میں نے لکھا تھا جسے انہوں نے بہت پسند فرمایا تھا۔ انکا منصوبہ تھا کہ یہ اور دوسرے ان کے ہمعصر اکابرین کے انکی شخصیت اور سیاسی وسماجی کارناموں پر لکھے گئے مضامین کتابی صورت میں وہ خود زیورِ طباعت سے آراستہ کریں گے۔ اُن کا انتقال دہلی میں ہُوا جہاں سے اُنکے جسدِ خاکی کو ہوائی جہاز کے ذریعہ سرینگر اور پھر بھاری جلوس کی صورت میں اُنکے آبائی گاؤں میر میدان ڈُورو لایا گیا جہاں انہیں اَپنے خاندانی مقبرے میں سرکاری اعزاز کے ساتھ سپردِ خاک کیا گیا۔ سرکاری طور تین دن کا سوگ منایا گیا۔ ضلع اننت ناگ بالخصوص ڈُورو میں انکے چہارم تک دوکانیں بند تھیں اور کاروبارِ زندگی معطل رہا۔ اُن کی وفات کے ساتھ ریاست میں سیاسی توقیر وتمکنت، شرافتِ نفس، حق گوئی، تحمل و تدبّر، عوام پَروری، امن وآشتی اور صلحِ کل جیسی ابدی قدریں ہم سے رخصت ہوئیں۔ اِنا لِلّٰہ وانا الیہ راجعون۔ بڑے پیمانے پر ریاستی اور ملک گیر سطح پر اظہار تعزیت کیا گیا لیکن سنگھ پریوار کے کسی بھی چھوٹے بڑے لیڈر نے ایسا کرنا اپنے لئے کسرِ شان سمجھا۔ شاید ذی عزت محکوم قومی اکائیوں کے ساتھ ایسا ہی غیر انسانی رویہ روا رکھا جاتا ہے بقول فیض، قاسم صاحب بزبان حال جیسے کہہ رہے ہوں۔

کرو کج جبیں پہ مرے کفن، یہ عدو کو میرے گماں نہو
کہ غرورِ عشق کا بانکپن پسِ مرگ ہیں نے بھلا دیا

☆☆☆

ماں!

اجانی مدّتوں سے رُوح اک احساسِ تنہائی کی قیدی ہے
کہ جیسے یہ زمیں یہ پیڑ پتّے سب اجڑنے کی نشانی ہیں
یہ سورج، چاند، تارے یہ ہوا سب ہی حریفِ جسم و جاں ہیں
سب ہی دشمن ہیں!
حصارِ چشم میں بس اِک الاؤ کب سے روشن ہے
زمیں بھی تنگ دامن ہے فلک بھی تنگ دامن ہے
مجھے واپس بُلا لو کاں!
مجھے احساس کے پیپے جہنم زار سے واپس بُلا لو
ماں! مرے بچپن کی وہ آغوش لوٹا دو!
یہ ہونے اور نہ ہونے کا عبث سود و زیاں چھوڑو!
سبھی وہم و گماں چھوڑو!
تعلق، دوستی، نفرت، رقابت، ساری دیواروں کو
ڈھا دو، ماں!
مجھے بچپن کے اپنے ریت کے کچے گھروندوں میں بٹھا دو ماں!
مرے باہر، مرے اندر کے بچے اور جھوٹے سب غموں سے
مجھ کو پھر آزاد کر دو!
ماں! مری تنہائی کی بنسی میں اپنی لوریاں بھر دو!
مری ماں، مری محسن!
پھر سمندر پار کے بے نام، بے شہرت جزیرے میں بُلا لو

تو ایک ساون تھی میرے گھٹنوں پہ آنسوؤں کی
تم اپنے بچے کے درد کو خوب جانتی تھی
تمہارے ہی مہربان ہاتھوں
درد کا میرے ہوا ہے درماں
یقیں کا آہن، تری محبت اور مہربانی
بنی ہے طاقت مرے بدن کی
کہ ہو کے بیباک اور نڈر میں
لڑوں اس دنیا کے رن میں
اور کامیاب لوٹوں
بروزِ محشر ملیں گے پھر ہم
میری اماں...!

☆

نظم

اَے سبک سادہ نشاں، پانی کی لہر
اَے گلِ امکاں خیز موجِ ہوا
میں.....زیاں احساس قطرہ قطرہ رات
تو.....سفر، ساکت سمندر، دائرہ
طائرِ لاہوت کا نغمۂ عدم
اک صلیبِ شاخ پہ آنکھیں سزا

☆☆

ایک بلاعنوان نظم

وہی ہیں درد، وہی غم، مسرتیں ہیں وہی
وہی فراق، وہی وصل، قربتیں ہیں وہی
محبتیں ہیں وہی اور نفرتیں ہیں وہی
جنونِ عشق کے اعزاز و نعمتیں ہیں وہی
وہی ہیں خوف، وہی ڈر ہیں، وحشتیں ہیں وہی
حقیقتیں بھی وہی ہیں، صداقتیں ہیں وہی
تعلقات بھی ویسے، عداوتیں ہیں وہی
نشیب بھی ہیں وہی اور رفعتیں ہیں وہی
جمود بھی ہے وہی اور وسعتیں ہیں وہی
وہی لہو و لعب ناؤ نوش ہاؤ ہُو
وہی قدیم مشاغل ہیں، فرصتیں ہیں وہی
کہانیاں بھی وہی ہیں، کہاوتیں ہیں وہی
کہ حرف و لفظ و بیاں کی نزاکتیں ہیں وہی
گھڑے گھڑائے وہی واقعے فسانے میں
یہ جز میرے تو نیا کچھ نہیں زمانے میں

☆☆☆

تحقیق

پھٹی پھٹی سی نگاہوں سے
تک رہے تھے سبھی
نسیں تنی تھیں
رگ جاں پھڑک رہی تھی
اچانک دِلوں کی دھڑکنیں
سر میں دھمکنے لگتیں تھیں
قطب نُما نہ کوئی بادنُما
اور نہ مرغِ بادنُما
ہوائیں، آندھیاں،
طوفانِ برف وباراں
تمام اہلِ صفت اَشک شوئی
کرتے رہے
کہ عارفانہ تجاہل،
دُعائے خیر،

خودکشی تھی کہ

دانستہِ اختناق

اَب کسے معلوم۔

بتا رہا ہے مگر آج کا آثار فروش

سبھی کو خوف تھا اَفشائے راز کا ورنہ

اندھیرا ڈھل جاتا

پُکارتا کوئی سم سم

تو دَر بھی کھل جاتا

☆☆☆

سرکارِ دو عالمؐ کا اَدبی ذوق

خوب ہے کسی دانشور کا یہ قول کہ ''نظر کے لئے تصویر بولتی ہے اور اہلِ دانش کے لئے تقریر''۔ یاد رہے کہ تقریر یہاں کلام کے معنی میں ہے اور کلام میں ہی کسی فرد کی وہ سوچ کہ جسمیں دعوت فکر و عمل، سیاست، ریاست، کردار اور انسان شناسی وغیرہ تمام باتیں شامل ہوتی ہیں۔ اور یوں یہی چیز ہر اُس فرد کی شخصیت کے تنقیدی مطالعہ کے لئے سنگ میل کا درجہ رکھتی ہے۔

اہلِ ذوق و نظر ہوں کہ صاحبانِ جستجو، صحیفہء سیرت حضرت سرورِ کونینؐ کی ورق گردانی کرنے والے لوگ جو ہیں، ان میں صدیوں سے بس یہی ایک بات نظر آرہی ہے کہ ہر شخص آپکی حیاتِ طیبہ کے مطالعہ کے دوران کبھی حیرت اور کبھی حیرت اور کبھی صد حیرت کا شکار نظر آرہا ہے۔ چونکہ آپکی ذات والا صفات ایسی بے مثیل و بے نظیر ہے کہ کسی بھی پہلو کا کوئی بھی فرد احاطہ نہ کر پایا۔

آدابِ بندگی ہوں کہ مسائلِ زندگی، حقوق اللہ ہوں کہ حقوق العباد، سیاست ہو کہ جذبۂ اُخوت میں سرشاری، حکمت ہو کہ صلہء رحمی و محبت، زبان و بیان ہو یا فہم و فراست اور فکر انگیزی، امانت و دیانت ہو یا ذکرِ دنیا و فکرِ آخرت، تمام معاملات میں یکتا اور اوصاف میں منفرد و تنہا۔ جبکہ تاریخِ عالم کا مطالعہ کرنے کے

بعد ہم دیکھ رہے ہیں کہ پوری دنیا میں جتنے بھی رہنما اور رہبران قوم آئے کہیں نہ کہیں کوئی نہ کوئی کمی ضرور نظر آرہی ہے۔

اہلِ علم و دانش ساڑھے چودہ سو سال سے تحریر و تقریر میں عمریں بتانے کے باوجود فکر و اندیش کے صحراؤں میں سرگرداں ہیں۔ اس کم مایہ کا ظرف نہیں کہ آپ کی ثناء و توصیف میں کوئی اضافہ کر سکے۔ البتہ حضورِ سیّدِ موجودات کی حیاتِ طیبہ کے ایک اور پہلو کے بارے میں جسکی طرف ابھی تک زمانے کی نگاہوں کی پہنچ بہت کم رہی ہے، خامہ فرسائی کی جسارت کر رہا ہوں اور وہ موضوع ہے جناب رسالت مآب کی شعر و ادب پر گہری نگاہ۔

ادباء و علماء کرام اس حقیقت سے بخوبی واقف ہیں کہ دنیائے عرب نے بہت سے اہلِ علم و فضل شعراء کو جنم دیا ہے۔ یاد دلانا چاہوں گا کہ اہلِ عرب میں جاہلیت کے زمانے میں شعر و شاعری کا رواج عام تھا اور قبائل عرب میں شاید ہی کوئی قبیلہ ایسا ہو جس میں کوئی قابل ذکر شاعر نہیں ہوتا تھا۔ دورِ جاہلیت میں اگرچہ امراء القیس، نابغہ ذبیانی، زہیر بن ابی سلمٰی اور اعشیٰ بن قیس صفِ اوّل کے شعراء مانے جاتے ہیں لیکن اِس دَور کے باکمال شعراء میں کچھ اور نام بھی ہیں جن میں سے اوس بن حجر، عنترہ بن شداد عبسی، مثقب عبدی اور متلمس ضبّی وغیرہ اعلےٰ پائے کے شاعر مانے جاتے تھے۔

زہیر عرب (زہیر بن ابی سلمٰی) اپنی قادر الکلامی کی وجہ سے زبردست شہرت حاصل کر چکا تھا۔ پھر اُسکے بعد اُس کے دو بیٹے کعبؓ اور بجیر ہیں (یہ دونوں بھائی بعد میں اسلام قبول کر چکے تھے) یہ دونوں بھائی شعراء مخضرمین میں شمار ہوتے ہیں مخضرمین یعنی وہ شعراء جنہوں نے جاہلیت اور اسلام دونوں زمانے پائے۔

اس پسِ منظر کے بعد آیئے شعر و ادب کے بارے میں دربارِ نبویؐ کے

تاثرات جاننے کی کوشش کریں۔ مستند تاریخی بیانات کے مطابق روایت ہے کہ جناب رسالت مآب کی مبارک محافل میں دین و دنیا کے سبھی مسائل پر جو نشستیں ہوا کرتی تھیں اُن میں کئی مواقع ایسے بھی آئے جب اِس پاک مجلس میں شعراء عرب کے بعض شاہکار ادب پاروں پر بھی سنجیدہ مکالمے ہوتے تھے۔ چنانچہ حضرت سیّد المرسلین بھی ان پر تبصرہ فرماتے تھے۔ آپ وقتاً فوقتاً جن شعراء کے کلام پر اپنی رائے کا اظہار فرماتے، انمیں کفر و اسلام کی کوئی حد بندی نہیں ہوا کرتی تھی۔ چند مثالیں بذیل پیش کی جاتی ہیں۔

صاحبِ کشف المحجوب ''شعر کا سماع اور متعلقات'' باب میں رقمطراز ہیں۔ ''شعر کا سننا مباح ہے پیغمبرؐ اور اصحاب کرامؓ اشعار پڑھتے اور سُنتے تھے۔ آپؐ نے فرمایا اِنَّ مِنَ الشَعرِ حِکمَتہ۔ بلاشبہہ بعض اشعار میں دانائی ہے۔ نیز فرمایا اَلحِکمَتُہ ضَالَّتہ المُئومِن حیث وَجَدَھَا فَھُوَ اَحَقُّ بِھَا یعنی حکمت مومن کی کھوئی ہوئی چیز ہے اُسے وہ جہاں بھی ملے وہ اس کا زیادہ مستحق ہے۔ (کہ حاصل کرلے)۔

آپؐ نے فرمایا صُدَق کُلِمَتہِ قَالَتھَا اَلعَرَب قَول لِبَیدِ۔ یعنی سب سے زیادہ سچا کلام جو اہلِ عرب نے کہا ہے وہ لبید (شاعر) کا ہے۔ چنانچہ لبید کا یہ شعر کافی سراہا گیا۔

اَلَا کُلّ شَیٔ مَاخَلا اللہ بَاطِل

وَکُلّ نعیم کَلَا مَحَالَتہَ زَائل

ترجمہ:۔ سنو! اللہ اَلاسوا ہر چیز باطل ہے اور ہر ایک نعمت ضرور زوال پذیر ہونے والی ہے۔ گویا لبید کا یہ شعر نعرہ تکبیر ہے کہ جس میں بجز سچائی کے اور کچھ بھی نہیں ہے۔ عمر بن الشریدؓ اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ ایک دن رسول ﷺ

نے مجھے شعر پڑھنے کا حکم دیا اور پوچھا کہ کیا تجھے امیہ بن ابی الصلت کے کچھ اشعار یاد ہیں؟ اور اگر ہیں تو ہمیں سناؤ۔ میں نے ایک سو اشعار سنائے، جب میں ایک شعر سناتا تو فرماتے کچھ اور سناؤ۔ آپ فرماتے رہے کچھ اور سناؤ۔ آپؐ نے فرمایا کہ اُمیہ اپنے اشعار میں تو اسلام کو تسلیم کرتا ہے۔"

روایت ہے کہ رسول ﷺ نے ایک موقعہ پر فرمایا، کَلَامِ حَسَنہ 'حَسَن وقَبِیحُھا 'قَبِیحَ' شعر ایک ایسا کلام ہے کہ جسکا اچھا (حصہ) اچھا ہے اور بُرا (حصہ) بُرا۔ ظاہر ہے کہ جس بات کا نثر میں (وعظ و تبلیغ اور تقاریر کی صورت میں) سُننا حلال ہے مثلاً نصیحت حکمت، آیاتِ الٰہی میں استدلال اور حق کے دلایل میں غور کرنا وغیرہ تو شعر میں انہی باتوں کا بیان کیونکر غیر شرعی و حرام ہے۔

آیئے دیکھتے ہیں کہ رسول خدا ﷺ کے مبارک زمانہ اور ماضیٔ قریب کے جو شعراء ہیں حضور سیدِ موجودات کیا فرماتے ہیں اُنکے بارے میں۔

امراء القیس عربی زبان و ادب کا ایک ایسا شاعر گذرا ہے جو عوام میں اتنا مقبول رہا کہ شاید ہی کسی اور شاعر کو اتنی پزیرائی نصیب ہوئی ہو۔ اس شاعر نے طلوع فجر اسلام سے چالیس سال قبل کا زمانہ پایا ہے اور اہلِ عرب میں اشعر الشعراء کے لقب سے مشہور ہوا۔ اِمراء القیس شراب و شباب کا مُبلغ شاعر تھا۔ اُسکے اشعار میں جام و مینا کی مدہوشیاں اور عشق و محبت کی سرمستیاں انگڑائیاں لیتی ہیں اس کا پورا دیوان حُسن و عشق کی ہوش ربا داستانوں اور جانگداز جذبوں، شراب ارغوانی کی کیف آورینیوں پر مشتمل ہے۔ اس میں آثارِ قدیمہ کی دلدوز داستانیں اور مراثی وغیرہ شامل ہیں۔

روایت ہے کہ ایک روز بارگاہِ نبویؐ میں اَشعر الشعراء لقب والے اس شاعر کے اشعار کا ذکر چلا، تو رسول خدا ﷺ نے اپنی رائے ظاہر فرمائی۔ اَشعرُ الشعراء لو قائدھم اِلی النار

یعنی وہ شاعروں کا سرتاج ہے اور جہنم کی طرف ان کا میر کارواں بھی۔

اسی طرح کی ایک اور روایت ہے کہ جب محفل سید الانبیاءؐ میں عرب کے ایک اور شاعر جسکا نام عنترہ بن شدّاد تھا۔ وہ بنو عبس قبیلہ سے تعلق رکھتا تھا۔ اصحاب رسول میں سے کسی صحابیؓ نے عنترہ کا یہ شعر محفل میں پڑھا۔

وَلَقَد ابیتَ عَلیٰ الطّوٰی وَاَظلّا،

حَتّٰی نال بہِ کریم الماکل [1]

(ترجمہ) میں نے بہت سی راتیں محنت و مشقت میں بسر کی ہیں تا کہ کل میں حلال (روزی) کے قابل ہوسکوں

جناب سرورؐ کونین یہ شعر سُن کر بہت ہی محظوظ ہوئے اور اپنے اصحاب باصفاء رضوان اللہ علیھم سے مخاطب ہوئے۔ لوگوں سے عنترہ کی بہت تعریفیں سُنی تھیں، لیکن ان میں سے کسی کی تعریف سے اُسکی طرف مائل نہ ہوا، لیکن میں سچ بیان کرتا ہوں کہ اب میرے دل میں اشتیاق پیدا ہو رہا ہے کہ میں اُس شخص کو دیکھ لوں۔ سبحان اللہ کہاں خدا اور اُسکی کائنات میں پیدا کیئں جو سبھی آپؐ کے رُخِ تاباں کو دیکھنے کے لئے اپنے دلوں میں بیتابیاں اور سینوں میں انگڑائیاں لیتی ہوئی بیقراریاں دن رات محسوس کرتے ہیں۔ اور یہ حُسن کل ونُورِ مجسم کہ ایک بُت پرست عربی سے ملاقات کا شوق فرما رہے ہیں۔

ایک اور واقعہ مورخین یوں بیان کرتے ہیں۔ کعب بن زہیر کاشانہ نبوت پر حاضر ہوا اور دربار سید المرسلینؐ میں ایک شعری نذرانہ پیش کیا جسے آپؐ نے ازحد

---

[1] بحوالہ "جناب رسالت مآب کا ادبی تبصرہ" ڈاکٹر سر محمد اقبال

پسند فرمایا، اپنے جسم اطہر سے بُردہ مبارک اُٹھایا اور کعبؓ کے کاندھوں پر اسطرح پھیلایا کہ وہ باران رحمت میں دُھل گیا جو کعبؓ بن زہیر کے اشعارِ بے مثال سے متعلق آپؐ کی محترم رائے کی واضع دلیل ہے۔ کعبؓ نے جب یہ قصیدہ بارگاہ اشرف الانبیاء علیہ صلواۃ والسلام میں پیش کیا اسوقت آپ (کعبؓ) محض چند ہی ایام پہلے کلمہ طیبہ پر لبیک کہہ اُٹھے تھے۔ یہاں پر اس بات کی وضاحت ناگزیر ہے کہ کعب کے اس قصیدہ اعتزاریہ (بَانَت سُعاد) کی بنیاد نفس جاہلی پر ہے نہ کہ نفس اسلامی۔ ظاہر ہے کہ اسوقت کعب تعلیم دین اور اصول اسلام سے بالکل ناواقف تھے۔ اس میں قرآن کریم کے آیات اور نبوت ورسالت کا کوئی ذکر نہ تھا۔ اصولِ اسلام، جیسے حیات بعد الموت کا تصوّر، محرمات سے اجتناب، جزاء وسزا کا تخیل ایضائے وعدہ اور عبادت الٰہی وغیرہ کا بیان کس طرح ہوسکتا تھا۔ لیکن حضور پاکؐ کعب کا یہ قصیدہ سماعت فرمانے کے بعد جو بہت مُسرور ہوئے عیاں ہے کہ اس شعری شہ پارے میں موجود اُس فن ادب کی سراہنا فرمائی جو حضرت کعب کی کاوش تھی۔

کعب، کا یہ قصیدہ تین اجزاء پر مشتمل ہے۔ یہ اجزاء بظاہر ایک دوسرے سے الگ ہیں مگر، دراصل ان میں نہایت حسین ترتیب موجود ہے۔ پہلا جز وتغزل اور تشبیب پر محتوی ہے دوسرے جُز میں ناقہ اور لوازمات کا وصف ہے اور تیسرے جُز میں آنحضرتؐ کی مِدح کی گئی ہے۔ تینوں حصوں میں شاعر کی بدیع نگاری، جدّت طرازی اور قوتِ فکر قابل داد ہے اسکی قادر الکلامی کا یہ عالم ہے کہ ایک ماہر فن کار کی طرح الفاظ ومعانی سے کھیلتا ہے۔ کعب کے ان اشعار میں برتے گئے تشبیہ واستعارات اور سلاست وروانی کے ساتھ خیالات کی پاکیزگی کا انداز واقعی دیکھنے

کی چیز ہے۔ یہی سب چیزیں اُسکے اشعار کو تمام عربی شاعری میں خصوصیت کا درجہ عطا کرتی ہیں۔

اگر چہ ان عربی اشعار میں برتی گئی فنکاری سے صرفاً عربی زبان کے ماہرین ہی بھرپور طور لطف اندوز ہو سکتے ہیں لیکن ہم یہاں پھر بھی چند اشعار پیش کرتے ہیں تا کہ کعبؓ کی اس تخلیقی کاوش کی تھوڑی سی وضاحت بھی ہو اور عربی نہ جاننے والے قارئین بھی حتی المقدور اس شاعر کی پرکاری سے لطف اندوز ہو سکیں۔

کعبؓ کا یہ قصیدہ اٹھاون ۵۸ اُشعار پر مشتمل ہے اور جیسا کہ بتایا گیا یہ قصیدہ تین اجزاء پر مشتمل ہے۔ یہاں ان تین اجزاء میں سے تین چار اشعار پیش کئے جاتے ہیں۔ چونکہ شعرائے عرب کا یہ طریقہ رہا ہے کہ جب وہ کوئی قصیدہ لکھتے تو اکثر ابتداء میں کسی خیالی محبوبہ کا ذکر چھیڑ کر تمہید باندھتے۔ کبھی بہار اور خزاں کبھی احوالِ خود تو کبھی احوال عالم سے بھی ابتدا کرتے، [۲] اور یہاں کعبؓ نے حسبِ دستور سُعاد نامی ایک خیالی محبوبہ کے متعلق بہت ساری باتیں بیان کی ہیں جس میں شعر کی نزاکت سے واقف یہ فنکار سُعاد کے سراپا سے لیکر اُسکے عادات تک کے سبھی حالات وواقعات بیان کرتا ہے۔ اور جس میں تشبیہات واستعارات کی ایسی مرصّع کاری ہے کہ قاری وسامع اس فنکاری کو دیکھتے ہوئے دنگ رہ جاتا ہے۔ یہی تشبیہاتِ محسوسہ اور اوصاف حسیہ کعب کے طرز کلام کی بنیادی خصوصیات ہیں۔ پہلے بند میں سے ایک یہ شعر پیش ہے۔

وُمَا تُمَسِّكُ بالعَهدِ الَّذی زَعَمَتْ

اِلّا كما يُمسِكُ المَاءَ الغَرَابيلُ

ترجمہ:۔ (محبوبہ سُعاد) نے جو بھی وعدہ کیا ہے اسپر قائم نہیں رہتی

ہے (مگر ہاں) اسی طرح جس طرح چھلنیاں پانی کو روکتی ہیں۔ (یعنی جس طرح چھلنیوں میں پانی نہیں رُکتا ویسے ہی سُعاد کسی ایک بات یا وعدے قائم نہیں رہتی) کعب کہتے ہیں کہ چھلنی میں ہزار بار پانی ڈالو لیکن اس میں ایک قطرہ بھی کبھی نہیں رُکتا۔ بس یونہی سمجھ لو کہ سُعاد کبھی بھی کسی وعدے کا ایفا نہیں کرتی۔ اُسکے خیال میں یہ عہد شکنی اسکی فطرت میں ہے۔ چھلنی میں پانی رُکتا نہیں سعاد کے دل میں عہد و پیماں کبھی رُکے نہیں۔ اور یہ کہ اُسکا ہر آن بدلنا اسکی فطرت میں ہے۔ اس تھوڑی سی تشریح کے بعد پڑھنے اور سُننے والے کعب کی اس نہایت نفیس حسیاتی وصف نگاری کو دیکھ کر میرے اور کعب کے دیگر معترف لوگوں کے ہم خیال نظر آئیں گے۔ کعب نے اس شعر کے بعد ایک دوسرے شعر میں اپنی محبوبہ کی اس عادت کے بیان کو جاری رکھتے ہوئے کہا ہے۔ اس ضمن میں اُسے جس محرومی کا شکار ہونا پڑا، اُسنے اسپر قنوطیت کے بجائے عقلیت کی راہ کھول دی ہے کہ ایسی تمنائیں اور ایسے سُہانے خواب جو پیمان گسل نگاروں سے وابستہ کئے جائیں نادانی ہے، باطل اور جھوٹے ہیں۔

جناب کعبؓ اس قصیدے کے دوسرے حصے، جزو نامہ میں تمازت بھرے صحرا میں اونٹنی کے سرپٹ دوڑنے کا احوال اس طرح بیان کرتے ہیں۔

لَوَّاحَتہ رِخوَۃ الضَّبعَین لَیسَ لَھَا
لَمَّانعیٰ بِکرَھُا النَّاعُون مَعقُول

ترجمہ :۔ (وہ اونٹنی) اپنی منزل کی طرف اسطرح سرگرم سفر ہے اور اپنے دوڑتے ہوئے پاؤں اسطرح چلاتی ہے جیسے ایک وہ عورت جسکی پہلوٹی اولاد کی موت واقع ہوئی ہو، اپنے دونوں ہاتھوں سے سینہ کوبی کرتی ہے۔ شدت غم سے

وہ عورت اپنے دونوں ہاتھ تیزی کے ساتھ چھاتی پر مارتی ہے۔ بالکل اُسی طرح سے یہ اونٹنی بغیر تھکن کے اس جلتے ہوئے صحرا میں دوڑتی ہے۔ اسی جُز میں سے یہ ایک اور شعر بھی ملاحظہ ہو ایک اور زبردست تشبیہہ دیکھیں اور تحسین کے پھول برسائیں۔

شَدَّ النَّهَارِ ذِرَاعاً نَصَفِ

قَامَت فَجَاوَ بَهَا نُكدُ ،متثا كِيلُ

ترجمہ:۔ دن چڑھنے کے وقت ادھیڑ عمر کی لانبی عورت جسکے بچے زندہ نہ رہتے ہوں، نوحہ گری اور بین کی غرض سے کھڑی ہو کر اپنے دونوں ہاتھوں کو بڑی پھرتی سے سینہ کوبی کے لئے اُٹھاتی ہے۔ اور ایسی عورتیں جنکے بچے نہ جیتے ہوں ہر بار رونے اور چھاتی پیٹنے میں مشاق ہوتی ہیں۔ یہ بے محابا ہاتھوں سے سینہ کوبی کرتی ہیں۔ بعینہٖ وہ اونٹنی شوق سفر میں اپنے سُم جلد جلد اُٹھاتی ہے۔ وہ عورت اضطراراً اپنے ہاتھوں کو حرکت دیتی ہے بالکل اسی طرح اونٹنی کے پاؤں بھی اضطراراً بسرعت اُٹھتے ہیں۔

اور اسی طرح اس قصیدے کے تیسرے جُز میں بھی خوبصورت خیالات دل آویز تشبیہات کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں۔ رسول خداؐ، اصحاب رسولؐ، بارگاہ نبویؐ اور دیگر معاملات رقم ہیں۔ ایک شعر یوں بیان ہوا ہے۔

اِنَّ الرَّسُولَ لَنُورٌ ، يُستَضَاءُ بِهِ

مُهَنَّدٌ مِن سُيُوفِ الله مَسلُولُ ،

ترجمہ:۔ بے شک وشبہ رسول اللہؐ ایک ایسا نور ہیں جن سے (عالم ارض وسماء) روشنی حاصل کرتے ہیں۔ روشنی دین وایمان کی، عاقبت

سنوارنے کے لئے، دنیاء وعقبیٰ میں سُرخروئی پانے کے لئے۔ آپؐ اللہ کی تلواروں میں سے ایک عمدہ شمشیرِ ہندی ہیں۔ (یہ تلوار نیام سے نکلی ہوئی اور کھینچی ہوئی ہے۔ ظلمت شرک وبدعت کے خلاف، ظلم وجبر کے مقابلے کے لئے۔ عالم انسانیت میں شرافت کو دوام بخشنے کیلئے۔)

اختلافِ نسخہ میں نور کے بجائے سیف بھی مروّی ہے۔ بیان ہوا ہے کہ اہلِ عرب کی یہ عادت تھی کہ جب کسی شخص کو اپنی قوم کے افراد کو اپنے گرد جمع کرنا مطلوب ہوتا تو اپنی چمکیلی تلوار کو بلند کرتا تھا۔ جب اسکی چمک دور سے دکھائی دیتی، تو لوگ یہ دیکھ کر اس شخص کے گرد جمع ہو جاتے تھے۔ شاعر نے رسول خداؐ کو ایسی ہی تلوار سے تشبیہہ دی ہے۔ یہاں پر مہنّد اور چمکدار تلوار سے اعلان کلمہ توحید بھی لیا جاسکتا ہے۔ جو کذب وباطل کے خلاف بُرہان قاطع ہے۔

بہر حال کعبؓ کے ان اشعار میں بے شمار خوبصورت خیالات اور تشبیہات موجود ہیں جو یہاں مضمون کی طوالت سے بچنے کے لئے چشم نظر نہیں کئے جاسکتے۔ کعبؓ کی اس شعری تخلیق میں عہدِ شرک کے نفسِ جاہلی کی جھلک کئی جگہ صاف طور نظر آتی ہے لیکن حضور سرورِ دو عالمؐ نے قصیدہ بیان کرتے ہوئے اُسے چپ نہیں کرایا ڈانٹ نہیں پلائی، بلکہ اس خوبصورت شعری گلدستہ میں موجود اس بے مثال فن کی سراہنا فرمائی۔ کیونکہ یہ نذرانہ عقیدت واقعی ایک ادب پارہ کی حیثیت سے سراہا گیا جس میں خیالات پاکیزہ اور بیان شفاف ہے۔

یہاں پر اس بات کا ذکر بے محل نہ ہوگا کہ اچھے ادب کی واضح صورت سامنے نہ ہونے کی وجہ سے ہی آج ہمارے شعروادب کے تخلیق کاروں اور اُنکے فاقدین کے درمیان کبھی روایتی اور ترقی پسندی، کبھی جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے

مباحث میں سر پھٹول چل رہی ہے۔ آج کے عالمی ادب میں نظریہ سازی کی یہ جنگ پورے جوبن پر ہے لیکن فیصلہ کرے تو کون؟

اب اگر ہم عہدِ رسالت کے ان تینوں واقعات پر غور کریں تو اُس نظریہ کی واضح صورت ہمارے سامنے آجاتی ہے جو ہمارے حضورؐ کا قائم کردہ ادبی معیار اور فن تخلیق کی پرکھ ہے، اور ہمارے لئے مشعل راہ۔ حضرت سرورِ کون ومکاںؐ کے زمانے میں عربی شاعری میں جو تبدیلی آئی اس میں عشق ومستی کی کیف آفرینی کے ساتھ ساتھ سیاسی شاعری کا رواج بھی چل نکلا جس میں کفارِ مکہ کے شعراء مسلمانوں اور محمد عربیؐ کے خلاف اشعار کہتے تھے۔ جن میں کچھ نام ابن زبعری، ہبیرہ بن ابی وہب اور ابن انطل وغیرہ ہیں۔ ان کے برخلاف جو شعراء نبی اکرم ﷺ کی طرف سے ان کا جواب دیتے تھے ان میں حضرت حسان بن ثابت اور حضرت عبداللہ بن رواحہ پیش پیش تھے۔ عین ممکن ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنا یہ پہلا اور آخری شعر اسی زمانے میں فرمایا ہو۔

؎ اَنَاالنَّبِیُّ لَا کَذِب ۔ اَنَابنُ مِن عبدِالمطلِب ؎

ترجمہ:۔ لاریب میں نبی اللہ ہوں اور آلِ عبدالمطلب ہوں۔

اگرچہ دربار رسالت مآبؐ سے ان دونوں اصحابؓ کی کافی پزیرائی ہوتی رہی، اور انعام واکرام سے نوازے گئے لیکن یہاں پر ہم ایک ایسے شاعر کا تذکرہ کرنا مناسب سمجھتے ہیں جو ایک کافر تھا اور مشرک مرا۔ اور وہ ہے بنوعبس قبیلہ کا نامور شاعر عنترہ۔ جسکا ذکر پہلے ہی سرسری طور سے آیا ہے۔ رسول رحمت ﷺ نے اس شاعر کی جو عزت افزائی فرمائی ہے وجہ اسکی ظاہر ہے کہ یہ مرحبا وآفرین اُسکے اشعار میں برتے گئے خیالات پر ہے جس میں انسان زندگی کے اُس اعلےٰ عمل کی

بات کہی گئی ہے جو اصل حیات کا ایک روشن باب ہے۔ اس شعر میں وہی خیال برتا گیا ہے جو آپ کی تعلیمات کا ایک جُز ہے۔ چنانچہ رسول محترم ﷺ کی ایک حدیث پاک ہے۔

''فریضہ خداوندی ادا کرنے کے بعد حلال روزی کی تلاش و جستجو ایک اہم ترین فرض ہے اور میرے نزدیک سب سے اچھا کھانا وہ ہے جسے تم اپنے ہاتھ سے کما کر کھاؤ۔'' مشکوٰۃ کی ایک اور حدیث مبارک میں یوں بیان ہوا ہے۔ عَن اِبنِ عُمرؓ اَنَّ النبیؐ قال اِنَّ اللہَ یُحِبَ المُئو مِنَ المُحترِفَ۔ المنذری بحوالہ طبہ۔

ترجمہ:۔ ابن عمرؓ روایت کرتے ہیں کہ حضور نبی کریمؐ نے فرمایا، اللہ تعالیٰ اُس مسلمان سے محبت رکھتا ہے جو محنت کر کے روزی کماتا ہے۔

عنترہ کے اس شعر پر آپؐ کے اس زبردست تبصرہ کی روشنی میں ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ پیغمبر اسلامؐ نے جو نظام حیات و کائنات پیش کیا ہے اس میں شعر و ادب کا کیا مقام ہے۔ انسانی تہذیب کی تعمیر و تشکیل میں ادب بشمول فنون لطیفہ کا کیا حصہ ہے۔ اور ادب و آرٹ کو تکمیل حیات کے لئے کیونکہ مربوط و منظم کیا جا سکتا ہے۔ اسکے ساتھ ہی ہمیں اس بات پر بھی غور کرنا ہوگا کہ تخلیقِ ادب کا مقصد جو شخصیت و انسانیت کی ہمہ جہت نشو و نما کرنا ہے کس حد تک رسول اللہ ﷺ کے فلسفہ تعلیم سے بھرپور ہے۔

یہاں اِسی دَور کے ایک اور شاعر کا تذکرہ بھی ناگزیر ہے جو حضور انورؐ کی دعوتِ رحمت میں سے اپنا حصہ نہ پا سکا، یعنی کلمۂ طیبہ پر لبیک پکارنے سے پہلے ہی انتقال کر گیا۔ حضرت امام الانبیاء علیہ الصلوٰۃ والسلام اُسکے اشعار بھی بہت پسند فرماتے تھے اور فرماتے تھے کہ وہ اسلام لاتے لاتے رہ گیا۔ اس شاعر کا نام

اُمیہ بن ابی الصّلت تھا۔اور یہ سرداران طائف میں سے تھا۔اس شاعر نے اپنے کلام میں توحید، آخرت اور جزاء وسزاء کے بارے میں اپنے بھرپور یقین کا مظاہرہ کیا ہے۔نیز اخلاق اور حکمت ودانائی وغیرہ مضامین نظم کئے ہیں۔

اس مقالے میں امرؤ القیس کی شاعری کے متعلق آپؐ کے تبصرہ کا بھی ذکر ہوا ہے۔کوئی شک نہیں کہ امرؤ القیس نے اپنے کلام میں زور بیانی کا بھرپور مظاہرہ کیا ہے اور اپنے سامعین وقارئین کو محوحیرت کرنے کے لئے اپنی تمامتر صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کی بھرپور کوششیں کی ہیں۔وہ اپنی رنگینی بیان سے ایک زبردست سماں باندھنے میں اگرچہ وقتی طور کامیاب بھی رہا ہے لیکن اُسکی وہ فن کاری صرف اور صرف تخیلاتی کائنات کی ایک معدوم دنیا ہے جہاں فکر آئندہ کا کہیں نام ونشان نہیں ملتا جہاں کردار سازی وانسان نوازی کے اسباق ناپید ہیں۔ امرؤ القیس کی شاعری کے متعلق حضور انورؐ کے یہ ارشادات اُسکے کلام میں اس داروئے بیہوشی کے متعلق ناپسندیدگی کا کا زبردست اظہار ہے جو ہوشیاری کے بجائے مستی وبے خودی کی کیفیت پیدا کرتا ہے یہ شاعر ''اصل زندگی کے تلخ حقائق سے خائف ہے۔جسطرح ہمارے یہاں کے بعض شعراء عمومی داد وتحسین کے متلاشی بنکر محض خوبصورت الفاظ کے سہارے شاعری میں آہنگ پیدا کرتے ہیں اور مشاعروں میں سامعین کے جذبات کو یکدم اُبھارنے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں۔اس بات کا اِدراک کئے بنا کہ سبھی سامعین وقارئین اتنی جلد بازی کا مظاہرہ نہیں کرتے، بلکہ اُسی شعر کو پسند کرتے ہیں جو اُنکے ذہن ودل پر دیرپا اثر چھوڑ دیتے ہیں۔یہ لوگ بہرصورت اُسی شعر کی سراہنا کرتے ہیں جو فرحتِ دل کے ساتھ ساتھ روح کو بھی تسکین پہنچا سکے۔ایسے قارئین شعر میں تہہ در تہہ چھپے

ہوئے معانی کے متلاشی رہتے ہیں۔

یاد رہے کہ ہر وہ شخص جو زندگی کو ایک ٹھوس حقیقت سمجھتا ہے۔ اُسکے نزدیک شعر و ادب اور آرٹ کی تمام تر قدر و قیمت کا انحصار اُسکی افادی اہمیت پر ہوتا ہے۔ ادب فنون لطیفہ تخلیق تجربہ اُس روحانی تجربہ سے مماثل ہے جسے مذہبی اصطلاح میں عرفان، الہام یا وارداتِ قلبی کا نام دیا جاتا ہے یا جدید فلسفے کی اصطلاح میں وجودی تجربہ کہا جاتا ہے۔ چونکہ ادب اور آرٹ تخلیق معاشرہ میں ایک اہم رُکن کی حیثیت رکھتا ہے اسلئے ایک فن کار کو چاہئے کہ اس خیال سے دامن چھڑا کر نہ چلے۔

رسول خدا ﷺ کے اِن تنقیدی تبصروں کی روشنی میں پرکھ لینے کے بعد واضح ہو جاتا ہے کہ اسلام جس تعمیر اخلاق کا مُدّعی و مُبلّغ ہے وہ نہ محض حضوری عرفانی ادب ہے نہ محض داخلی تجربے کا بے ڈھنگا اظہار۔ جھاگتی آنکھوں کا حصہ بھی ادا ہو تو اس فرض کا قرض ادا ہو سکتا ہے اور یوں یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ اعلےٰ ادب میں کس طرح انسانی شخصیت کی صحیح معنوں میں نشو و نما ممکن ہے اِتنا ہی نہیں بلکہ اسی قسم کے ادبی تخلیقات اخلاقی تربیت اور معاشرتی شعور عطا کر سکتے ہیں۔ اس طرح سے اچھے ادب کی تخلیق پیغمبر اسلامؐ کے نقطۂ نظر سے ایک سطح پر تعمیر اخلاق و معاشرت اور دوسری سطح پر جُزو ایمانی ہے۔ آپ کی ایک مشہور حدیث پاک ہے۔ (بُعِثتُ لِاُتَمِّمَ مَکَارِمَ الاَخلَاقِ) ترجمہ میری بعثت کا مقصد مکارم اخلاق کی تکمیل ہے۔ ظاہر ہے کہ ایک اچھا ادبی شاہکار اخلاق و دین کا مصدر بھی ہے۔ یہاں اس بات کی بھی وضاحت ہو جاتی ہے کہ ایک ادیب و شاعر غیر شائستگی کی سرحدوں میں کبھی داخل ہو ہی نہیں سکتا۔ مشرقی دنیا کے ایک عظیم فلسفی خلیل جبران کا یہ قول کہ "ایک شاعر کو چاہئے کہ سنجیدگی کا دامن ہاتھ سے چھوٹنے نہ پائے۔ ایک شاعر کو چاہئے کہ

وہ ہر مرحلے پر نازیبا کلام سے احتراز کرے، کیونکہ ایک فن کار و ادیب معتبر و مقدس شخصیت کا مالک ہوتا ہے۔

دین اسلام میں فن ادب کی تخلیق کے جواز میں اس سے بڑھ کر ثبوت کیا ہوسکتا ہے کہ علم (تخلیقی اداب) کے سلسلے میں کتابت پر نبی کریمؐ نے تاکید فرمائی ہے۔ فرماتے ہیں۔ قَیِّدُوا العِلمَ بِالکِتَاب ؎ علم کو قلمبند کرو۔ مُفسرین کا قول ہے قرآن کریم میں کتاب اور کَتَبَ کے سلسلے میں جتنی بھی آیات ہیں حدیث پاک اُن کا خلاصہ ہے۔ اس تحریر علم میں شعر و ادب دونوں چیزیں شامل ہیں۔ ظاہر ہے کہ موضوع چاہے کوئی بھی ہو تخلیقی ادب ہی بہر صورت علم کا سرچشمہ ہے۔

اس ضمن میں رسول اللہ ﷺ کی مبارک محافل میں سے ایک نشست کا بیان یہاں پر کرنا چاہوں گا تا کہ بات کی مزید وضاحت ہو۔

بات اس طرح ہے کہ جب حضور ﷺ اپنے اُس پہلے دور سے بحسن و خوبی کامیاب لوٹے، جہاں آپؐ اور آپکے ساتھی لوگوں کے پاس جا جا کر دعوت اسلام دیا کرتے تھے اور جب دین مبین کے خلاف تمام منفی رجحانات ختم ہو چکے، ساری مزاحمتیں دم توڑ گئیں تو دوسرے دور میں اطراف و اکناف سے لوگ اس مرکزِ نور یعنی مدینہ طیبہ کی طرف دربار سید موجودات میں وفود کی شکل میں آتے رہے۔ ایک دن بنو اسد قبیلہ کا وفد بھی حاضر خدمت ہوا جس میں شامل افراد نے مختلف مسائل کے بارے میں احکامات حاصلِ کئے۔ اسی دوران انہوں نے خط یا تحریر کے بارے میں بھی سوال کیا، کہ یہ چیز اسلامی رو سے جائز ہے کہ ناجائز تو حضرتؐ نے فرمایا۔

''یہ تو کسی نہ کسی نبی ہی کا آغاز کردہ فن ہے، اور اس سے اچھا علم اور کیا ہو سکتا ہے۔'' اس ماخذ علم کی بات کرتے ہوئے حضور سید الانبیاءؐ کے خطوط کا بطور

خاص ذکر کرنا چاہیں گے جو بین الاقوامی ادب کا ایک روشن باب ہے۔

تاجدارِ کونینؐ نے دعوت اسلامی کے سلسلے میں جو خطوط دنیا کے عظیم کج کلاہوں کے نام بھیجے ہیں وہ بلاغت کلام کا ایسا کمال ہے جس کا کہ جواب وثانی ملنا مشکل ہے۔ یہ خطوط جہاں ان القابات کے ساتھ شروع ہیں ''عظیم الروم''''عظیم الفارس''''عظیم القبطه'' وغیرہ لکھ کر مخاطب فرمایا ہے۔ وہیں اَسلِم تَسلَم اسلام لاؤ سلامتی پاؤ۔ اور فَعَلَیكَ اثمُ المجوس، یااِثمَ اَهلِ القَبطه یعنی تم پر اپنے قوم کا وبال ہے، رب کی پکڑ ہے۔ دوسرے معنیٰ میں تمہیں کیفر کردار سے دوچار ہونا پڑیگا۔ دعوت اسلام کے ضمن میں نرمی بھی ہے اور للکار کی سخت باتیں بھی لیکن سیاسی انداز اور شستہ سفارتی زبان، کم سے کم الفاظ اور زیادہ سے زیادہ تفصیل مدعا۔ یاد رہے کہ یہ خطوط مختلف حکمرانوں کے نام انکے مذہب اور ملک وقوم کے مخصوص حالات کے زیر نظر مختلف اندازِ تحریر کے ہیں۔ ایک ہی تحریر کو مختلف لوگوں کے نام رٹ لگا کر ارسال نہیں کیا گیا ہے اور اسطرح پیغمبرِ اسلامؐ نے نہ صرف تخلیقی ادب کی سراہنا فرمائی بلکہ زندگی کے دیگر شعبوں کی طرح عملی مظاہر سے اس عمل میں بھی مختصراً بھرپور شرکت فرمائی ہے۔

قَیِّدوا العِلم والی اس حدیث مبارک کی مزید وضاحت کے لئے خانوادۂ رسول ﷺ کے ایک دلبند فرزند کا قول بھی ملاحظہ فرمائیں۔

عملی طور پر یہ بات قلم کار کے لئے کوئی ان دیکھا تجربہ نہیں، ہر تخلیق کار بخوبی واقف ہے کہ جب وہ کسی خاص وقت پر ایک خاص بے چینی محسوس کرتا ہے اور جب وہ قلم وکاغذ اُٹھا کر کوئی نظم یا نثری پارہ قلمبند کرے، تو وہ چند ثانیہ کے بعد اپنے آپ کو پرسکون محسوس کرتا ہے۔

روایت ہے کہ حضرت امام جعفر صادقؑ نے فرمایا۔ ''دل کو نوشتے سے اطمینان ہوتا ہے۔ اپنے نوشتوں کو محفوظ رکھو، تاکہ آئندہ اُن سے فائدہ اُٹھا سکو۔''

ایک اور موقعہ پر آپ نے مفصل فرمایا ہے ''لکھو اور اپنے علم کو اپنے دوستوں کے درمیان پھیلاؤ، اور جب وقت مرگ آئے تو انہیں اپنے بیٹوں کو بطور میراث سپرد کرو، کیونکہ جب فتنہ و آشوب کا زمانہ آتا ہے تو بجز کتاب کوئی اور مونس و دمساز نہیں ہوتا'' ۵

یہاں علم و ادب تخلیق کرنے کے بعد اسکا ابلاغ بھی ضروری گردانا گیا ہے حضرت امامؑ کی اس عبارت میں کہیں بھی ذکر نہیں کہ صرف روایتی مذہبی مضامین تحریر کئے جائیں۔ چونکہ تخلیقِ ادب سید الانبیاءؐ کے پاس نہ صرف جائز ٹھہرا بلکہ مرغوب بھی یہاں پر مولوی صاحبان کی تخلیق کردہ اُس ذہنی اختراع کی سریحاً نفی ہو جاتی ہے کہ مذہب اسلام میں تخلیق ادب کی کوئی دلیل نہیں، شعر کہنے کا کوئی جواز نہیں۔ اور یوں بھی یہ بات واضح ہے کہ جو کچھ پیغمبرؐ کو منظور خاطر ہو مجتہدین کے اجتہاد سے بالاتر ہے۔ وَلَا یَبعَثُ اللہُ نَبیاً وَلَا رُسو لا حتیٰ یَستکمل العَقلَ وَیَکُونَ عَقلَہ اَفضلُ مِن جَمیعِ عَقُول اُمَّتِہ۔

یہ بھی یاد رکھنے کی بات ہے کہ ادب ہی تو علم کا منبع ہے علم جہل کی ضد ہے علم نفع ہے جبکہ جہل نقصان و خسران۔

ذرا سا تجسس سے کام لیں تو ہم اس نتیجہ پر پہنچ جائیں گے کہ دوسرے کسی بھی مذہب یا فلسفے نے علم و ادب کا اتنا وسیع تصور پیش نہیں کیا۔ نہ ایسا طریقہ تعلیم جو ذہن و دل اور عقل و جذبات کی، اور دنیاوی امور کے ساتھ اخلاق کی بھی نشو و نما کر سکے، یہ ہماری آقا فراموشی ہے کہ آج ہم دوسری قوموں کے مختلف

فلسفوں سے متاثر و مرعوب ہوئے ہیں اور مدعیان عمل میں روز بروز سست گام ہو تے جارہے ہیں۔ حالانکہ قرآن پاک کی یہ آیت واضح طور ہمارے سامنے ہے۔

یَا اَیُّھَا النَّبِی اِنَّا اَرسَلنَاکَ شَاھِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِیرًا۔ ۶

رسولؐ اُمت پر گواہ ہیں، وہ تعلیم دیتے ہیں بشارت کے ساتھ یعنی تشویق وترغیب دلاتے ہیں علم واخلاق کے فوائد سے آگاہ کر کے، جستجوئے صداقت اور تکمیل مکارم اخلاق پر آمادہ کرتے ہیں۔ وہ ڈراتے ہیں یعنی متنبہ کرتے ہیں حق گریزی واخلاق سوزی کے نتائج سے۔ یہ تنبیہ صرف ڈرانا دھمکانا نہیں عاقبت اندیشی کی تعلیم ہے، خطرات آئندہ سے مطلع کرنے کا نام ہے۔ رسول ﷺ نے اپنی اُمت کے ساتھ ہر حال میں رہ کر، سفر میں حضر میں، امور انتظامی ومالی کے دوران میں، جنگ میں عبادت میں، مسجد میں مجلس میں، ادبی محفل میں بازار میں، میز بان اور مہمان بن کر اُسی اصول تعلیم کو برتا اور اپنی تعلیم کے نقوش دلوں اور روحوں پر مرتسم کئے۔ بلاغ مبین کا امتیاز وصف یہ ہے کہ جو بات فلاسفر سینکڑوں اوراق اصطلاحات کے لفافے میں بند کر کے پیش کرتے ہیں۔ پیغمبر انہیں چند مختصر کلمات میں کھول کر اس طرح بیان کر دیتے ہیں کہ وہ دل ودماغ دونوں پر ثابت ہو جاتی ہے۔ مگر، اِن مختصر کلمات کے معانی ورموز عام عوام کو بتائے کون، سمجھائے کون؟ جاہل لوگ منبروں میں آکر اپنی تیز وتند تقریروں کی گھن گرج سے عام عوام کو مسجد بیزاری کی ترغیب دیتے ہیں۔ اپنی بے عملی کی وجہ سے انہوں نے پُر اثر کلمات کو اتنا بے اثر بنا دیا ہے کہ انکی کوئی بات دل میں اُترتی ہی نہیں۔

بہر حال پیغمبر اسلامؐ نے جو درس دیا ہے وہ مُسلم ہے کلمہ اِقراء کو گونج شش جہت میں ہے صحیفہ فطرت کے صفحات مطالعہ کے منتظر ہیں۔ مُعلّمِ علم وعقلَ نبی

الامینؐ نے خامہ و قرطاس اُمت کے ہاتھوں میں تھمائے رکھا ہے۔ بس ہمارے سوچنے کی دیر ہے کرنے کی بات ہے۔

///☆☆☆☆☆☆///

حوالہ جات

(۱) آیت قرآن حکیم

(۲) احادیث نبویؐ مشکواۃ

(۳) کشف المحجوب

(۴) قصید بانت سُعاد کعب بن زہیرؓ

(۵) ''ماہنامہ اقبال'' آسنسوال

(۶) سہ ماہی توحید تہران ایران جلد ۱ شمارہ ۲ بحوالہ الحرانی وتحفۃ العقول

(۷) ماہنامہ ''بیسوی صدی'' دہلی

(۸) ''توحید'' ایران بحوالہ اصول

☆

☆اپنی نگارشات صاف صاف' اور کاغذ کے ایک ہی طرف لکھیں۔ تبدیلی پتہ/یا فون نمبر بدلنے کی صورت میں ہمیں مطلع کرنا نہ بھولیں۔ (ادارہ)

☆☆

م۔م۔راجندر☆

انصاف

کردار.....

۱۔ خان وجاہت حسین	امیر نصیر آباد
۲۔ نواب امیر بخش	والئی دولت آباد
۳۔ اصغر علی	نواب امیر بخش کا ایک فوجی افسر
۴۔ سلیم	اصغر علی کا مددگار اور راز دار سپاہی
۵۔ خدا بخش	نصیر آباد کے مسافر خانے کا مالک
۶۔ زینب	خدا بخش کی حسین نوجوان لڑکی
۷۔ جمال آرا	زینب کی نوجوان خوبصورت ملازمہ اور راز دار
۸۔ شوکت	نصیر آباد کا ایک خوب رو نوجوان بڑھئی

پس منظر سے آواز

آواز: بہت پرانی ہے۔شمالی ہندوستان کے وسط میں ایک چھوٹی سی ریاست نصیر آباد تھی جس کے امیر خان وجاہت حسین تھے۔دراصل یہ ریاست کیا ایک تعلقداری یا جاگیر تھی۔اس کی حدود صرف ایک چھوٹے سے شہر نصیر آباد اور اُس سے ملے ہوئے دو تین گاؤں کا احاطہ کرتی تھیں۔اس کی کوئی فوج نہیں

تھی۔صرف ایک تھانہ تھااور اُس کا کوتوال اپنے مٹھی بھر سپاہیوں کے ساتھ ریاست میں امن قائم رکھتا تھا۔یہی سپاہی نصیرآباد کے دو بیرونی پھاٹکوں کی حفاظت بھی کرتے تھے۔امیر کی رہائش گاہ جوایک حویلی تھی، محل کہلاتی تھی۔شہر میں ایک بڑا مسافر خانہ تھا جس میں باہر سے آنے والے لوگ کھانے اور رہائش کے لئے دام دے کر ٹھہرتے تھے۔اس کا مالک ایک خوشحال زمیندار خدا بخش تھا۔کھانا خدا بخش کی بے حد حسین نوجوان لڑکی زینب اور اُس کی نہایت طرحدار اور چُلبلی خادمہ اور رازدار جمال آرا بناتی اور کھلاتی تھیں۔نصیرآباد کی عورتیں پردہ نہیں کرتی تھیں۔

چونکہ یہ ایک کمزور ریاست تھی، آس پاس کی دوسری ریاستوں سے خطرہ تو بنا رہتا تھا مگر اتفاق سے اس بے فوج کی ریاست پر آج تک کسی نے حملہ نہیں کیا تھا۔ مگر پاس کی ریاستیں یہاں کے نوجوانوں کو اپنی فوج میں بھرتی کرنے کیلئے امیر سے اجازت لے کر اپنے اہلکاروں کو بھیجتی رہتی تھیں۔نصیرآباد کے باشندے لمبے قد اور مضبوط جسم کے ہوتے تھے۔نصیرآباد میں باہر کے لوگ داخل تو ہو سکتے تھے مگر پھاٹک سے نکلنے کیلئے کوتوال کی تحریری اجازت ضروری ہوتی تھی۔

اس وقت گھوڑوں پر سوار دولت آباد کے نواب امیر بخش کے دو فوجی، اصغر علی اور سلیم نصیرآباد میں داخل ہو کر محل کی طرف فوجی جوان بھرتی کرنے کی اجازت لینے کے لئے بڑھ رہے ہیں۔

اصغر علی: چوبدار، کیا امیر نصیرآباد محل میں تشریف فرما ہیں؟ اُن سے کہو کہ دولت آباد کی فوج کے افسر اصغر علی اور اُن کا اردلی سپاہی سلیم حاضرِ خدمت ہونا چاہتے ہیں۔

چوبدار: جناب آپ اندر تشریف لے جایئے۔حضور والا آپ کے

منتظر ہیں۔

اصغر علی: (اندر پہنچ کر) حضور کی خدمت میں یہ ناچیز سلام عرض کرتا ہے' بندے کا نام اصغر علی ہے اور یہ میرا اردلی سپاہی سلیم ہے۔ جناب کو ہمارے آنے کا علم تو ہوگا ہی۔

خان وجاہت حسین: ہمیں علم ہے۔ ہم آپ کو اجازت دیتے ہیں اور کوتوال کو اس کی اطلاع کر دی جائے گی۔ مگر آپ ہمارے آدمیوں کے ساتھ نرمی سے پیش آئیں اور کسی کو زبردستی بھرتی نہ کریں۔

اصغر علی: حضور اس بارے میں اطمینان رکھیں۔ آپ کو کوئی شکائت نہیں ہوگی۔

خان وجاہت حسین: کتنے آدمی بھرتی کریں گے؟

اصغر علی: حضور کوئی دس بارہ۔ یہ کام کوئی چار پانچ دن میں پورا ہو جائیگا۔

خان وجاہت حسین: آپ ٹھہریں گے تو مسافر خانے میں ہی؟

اصغر علی: جی حضور۔

خان وجاہت حسین: بہتر تو آپ کام شروع کیجئے۔ لوٹ کر جانے کی راہداری آپ کو ہمارا کوتوال دیدے گا۔

(اصغر علی اور سلیم باہر چلے جاتے ہیں اور اپنے گھوڑوں پر سوار ہو کر مسافر خانے کی طرف بڑھ جاتے ہیں)۔

سلیم: لیجئے جناب یہ آ گیا خدا بخش کا مسافر خانہ۔ اس سے ملے ہوئے اصطبل میں پہلے اپنے گھوڑوں کو باندھ دیتے ہیں۔ یہاں گھاس اور پانی کا سب انتظام ہے اور رکھوالا بھی بہت اچھا ہے۔ لیجئے گھوڑے تو بند ہو گئے۔ اب مسافر خانے چل کر آخر کے دو کمرے لے لیتے ہیں۔ وہ ٹھنڈے ہیں اور اُدھر تخلیہ بھی

رہتا ہے۔

اصغر علی: ٹھیک ہے مگر اندر جانے سے پہلے میری بات سن لو۔ میں اس کام کے لئے کسی اور افسر کو بھی بھجوا سکتا تھا مگر میں نے مسافر خانے کے مالک خدا بخش کی بیٹی زینب کے حسن و شباب کے اتنے چرچے سنے ہیں کہ میں تو اُسے دیکھے بغیر ہی اُس پر فریفتہ ہو گیا ہوں۔ سنا ہے طرح طرح کے لذیز کھانے اپنے ہاتھ سے تیار کرتی ہے اور اگرچہ خود پیتی نہیں ہے مگر ساقی کے فرائض اور سلیقے میں بھی ماہر ہے۔ یاد رکھنا یہاں ہم نوجوانوں کو بھرتی کریں یا نہ کریں تمہارا ایک کام یہ ہوگا کہ کسی طرح ہمارے لئے زینب کو شیشے میں اُتارو۔ تم تو یہاں ایک دو بار پہلے بھی آ چکے ہو؟

سلیم: ہاں جناب۔ میں بھی یہ عرض کرنا چاہتا تھا کہ زینب کی خادمہ جمال آرا بھی بڑی تتالہ ہے۔ میری بھی طبیعت اُس پر ہے۔ پچھلی مرتبہ اُسے اپنے دام میں پھنسانے کی بڑی کوشش کی تھی مگر وہ آنا کانی کر گئی۔ قسمت نے یاوری کی تو اب کے کامیابی نصیب ہو جائے گی۔ اُس کے ذریعے آپ کے لئے زینب پر بھی ڈورے ڈالوں گا۔ اس مسافر خانے کی ساری آمدنی اِن دو کافر اُدا حسیناؤں کی وجہ سے ہے۔ آیئے جناب اب اندر چلتے ہیں۔

(دو دن کے بعد)

اصغر علی: میاں سلیم آج ہمارا تیسرا دن ہے مگر زینب کے دیدار دو دفعہ اور وہ بھی دُور سے ہی نصیب ہوئے ہیں۔ واللہ حسن و شباب کی کیا ہوشربا تصویر ہے! سلیم کچھ کرو۔ میں تو اس سے بات کرنے کے موقع کو حاصل کرنے کے لئے تمہارے ساتھ بھرتی کو بھی نہیں گیا مگر وہ تو ادھر پھٹکی بھی نہیں۔ ایک دو بار خود اُس کی طرف گیا تو اُسے ایک نوجوان سے محوِ گفتگو پایا۔ دل

پرچھریاں سی چل گئیں۔ خیر تم یہ بتاؤ کہ ان دو دنوں میں تم نے کتنے آدمی بھرتی کئے؟

سلیم: دو کل، تین آج۔ باقی کے پانچ آدمی بھی دو تین دن میں بھرتی کر لیں گے اور جناب آج خدا بخش مسافر خانے کے لئے سامان خریدنے بازار جا رہے ہیں۔ وہ دو تین گھنٹے تک نہیں لوٹے گا۔ آج ہم دونوں کے لئے بہترین موقعہ ہے اپنی قسمت آزمانے کا۔ دونوں لڑکیاں مسافر خانے میں اکیلی ہونگی۔

اصغر علی: یہ تو تم نے اچھی خبر سنائی۔ مگر سلیم میں دیکھ رہا ہوں کہ ایک حسین اور بلند قامت نوجوان ہر روز یہاں آتا ہے اور زینب اُس سے ہنس ہنس کر بات کرتی ہے۔ جانتے ہو کہ وہ کون ہے اور یہ کیا ماجرا ہے؟

سلیم: جناب وہ ایک بڑھئی ہے اور اُس کا نام شوکت ہے۔ کئی سالوں سے اُس کا اور زینب کا چکر چل رہا ہے۔ خدا بخش نے بھی اس معاملے میں آنکھیں موند رکھی ہیں۔ زینب اُس سے مرمت کا کام دیتی ہے اور اس بہانے وہ مسافر خانے آتا رہتا ہے۔

اصغر علی: یہ تو تم نے ہماری ساری اُمیدوں پر پانی پھیر دیا۔ ہم ٹھہرے اُدھیر عمر کے آدمی، ہماری دال اُس نوجوان کے آگے کیا گلے گی۔ تم شوکت کو بھرتی کر کے دولت آباد کیوں نہیں بھجوا دیتے؟۔

سلیم: میں نے بات کی تھی مگر اُس نے صاف انکار کر دیا۔ زبردستی کی تو معاملہ بگڑ جائے گا۔ جناب، پھر بات کریں گے، خدا بخش ادھر ہی آ رہا ہے۔

خدا بخش: معزز مہمانو، خدا بخش سلام عرض کرتا ہے۔ میں چند گھنٹوں کے لئے باہر جا رہا ہوں۔ آپ کو کوئی چیز درکار ہو تو زینب یا جمال آرا کو بلوا لیجئے۔ اور ہاں جناب اگر دو دن کے قیام کا خرچہ جو مبلغ تین اشرفی آتا ہے مجھے عنایت

کریں تو نوازش ہوگی۔ میں کچھ سامان خریدنے جا رہا ہوں۔

اصغر علی: یہ لیجئے آپ پانچ اشرفیاں رکھ لیجئے۔ حساب بعد میں ہو جائے گا۔

خدا بخش: بہت بہت شکریہ جناب۔ خدا حافظ۔

اصغر علی: لو اَب یہ بوڑھا تو گیا۔ میدان اب صاف ہے۔ تم جا کر اپنی جمال آرا سے ملو اور زینب سے کہنا ہم نے ایک گلاس شربت انگوری مانگا ہے۔ جمال آرا کو کہہ کر زینب کو ہی بھجوا دینا۔ جلدی کرو۔

سلیم: زینب ہی آئے گی جناب۔ مگر آپ ذرا تیار تو ہو جایئے۔ کپڑوں پر عطر لگا لیں۔ قسم خدا کی آپ پچیس تیس سے زیادہ کے نہیں لگتے۔

(وقفہ)

سلیم: بی جمال آرا ادھر تو آؤ۔ جانِ من پان بنا رہی ہو تو ایک گلوری اپنے اِس غلام کے لئے بھی لے آؤ۔

جمال آرا: لیجئے یہ پان ہے۔ مگر یہ بتایئے کہ آپ کو یہاں آئے ہوئے صرف دو دن ہوئے اور میرے غلام کیسے ہوئے۔ بڑے دل پھینک معلوم ہوتے ہو۔

سلیم: جمال آرا یوں نہ کہو۔ میری تمہاری پرانی شناسائی ہے۔ جب دو مہینے پہلے آیا تھا تو تم نے کتنے تڑپایا تھا۔

جمال آرا: سپاہی کی محبت کا کیا اعتبار۔ آج یہاں تو کل وہاں۔

سلیم: تم سلیم کو ایسا نہیں پاؤ گی۔ ارے ہاں تم نے اپنے ہاتھ کا پان کھلایا مگر ہم نے تو نذرانہ دیا ہی نہیں۔ لو یہ اشرفی سنبھالو۔

جمال آرا: رہنے دیجئے۔

سلیم: نہیں رکھ لو۔ اِن اشرفیوں کی تمہارے لئے کوئی کمی نہیں۔ سرکار

سے کسی اور کام کے لئے ملتی ہیں اور ہم اپنے کام میں خرچ کر دیتے ہیں۔ اور ہاں تمہاری مالکن زینب نہیں نظر آ رہی؟۔

جمال آرا: وہ بیٹھی ہے سامنے والے جھروکے میں۔ اپنی صندوقچی کو دیکھے جا رہی ہے جو اُس نے اپنے محبوب شوکت بڑھئی سے بنوائی ہے۔ وہیں بیٹھی اُس کی راہ بھی تک رہی ہے۔ صندوقچی کو مرمّت کے لئے دے گی۔ آٹھ بار تو پہلے ہی اس کی مرمّت ہو چکی ہے۔

سلیم: مگر جمال آرا کہاں وہ حُسن و شباب پُتلی زینب اور کہاں وہ دو کوڑی کا بڑھئی۔ زینب تو کسی بھی حویلی کی زینت ہو سکتی ہے۔ ہمارے افسر اصغر علی بھی اُس پر لٹو ہو گئے ہیں۔

جمال آرا: ارے میاں کچھ تو سوچ کر بولو۔ کہاں پچاس سے اوپر کا بوڑھا اور کہاں یہ کچی کلی۔ کیا تمہارے افسر نے شادی نہیں کی یا بیوی جنت سدھا گئی یا اِدھر اُدھر منہ مارنے کی عادت ہے؟۔

سلیم: کیا بات کر رہی ہے۔ ابھی کنوارے ہیں اور عمر بھی کچھ زیادہ نہیں ہوئی۔ مشکل سے پینتیس ۳۵ کے ہوں گے۔ اور مرد کی عمر انہیں مرتبہ دیکھا جاتا ہے۔ تم زینب سے بات تو کر لو اور ایک دفعہ تو اُن سے ملوا دو۔ ارے ہاں میں تو بھول ہی گیا۔ یہ اشرفی انہوں نے تمہارے لئے بھجوائی ہے۔

جمال آرا: اشرفی تو خیر رکھ لیتی ہوں مگر اُڑتی چڑیا کو پکڑنا بڑا مشکل ہے۔ وہ تو شوکت کی محبت میں گرفتار ہے۔

سلیم: کوشش تو کرو۔ اور ہمارے لئے کیا حکم ہے۔ آج ہی کوئی ملاقات کی صورت نکال لو تو زہے نصیب۔

جمال آرا: سوچوں گی مگر مشکل لگتا ہے۔ عاشق ہو تو صبر کرنا سیکھو۔ صبر کا

پھل میٹھا ہوتا ہے۔

سلیم: اور ہاں ذرا زینب سے کہہ دینا ایک گلاس انگوری شربت اصغر علی صاحب کو دے آئے۔ انہوں نے منگوایا ہے۔ تم نہ لانا' اُسی کو بھیج دینا۔

(وقفہ)

زینب: لیجئے صاحب' یہ انگوری شربت جو آپ نے منگوایا تھا۔

اصغر علی: زینب میں تمہارا شکریہ کن الفاظ میں ادا کروں کہ تم نے اس ناچیز کو اُپنے دیدار سے نوازا۔ میں نے تو دراصل جامِ انگوری منگوایا تھا مگر سلیم نے بتایا کہ تمہارے مسافر خانے میں شراب نہیں ملتی۔ خیر میرے لئے تو تمہارے ہاتھوں کا یہ شربت ہی جامِ انگوری ہے۔ پھر تم سراپا جامِ انگوری ہو۔ اگر تمہاری نظرِ التفات ہو جائے تو ہم تمہارے غلام ہو جائیں گے۔ قسم پروردگار کی تم جیسی حسین عورت ہم نے اس سے پہلے نہیں دیکھی۔

زینب: پہلے یہ گلاس تو پکڑیئے۔ آپ کا ذکر مجھ سے جمال آرا نے کیا تھا۔ مگر میں تو پہلے ہی سے اسیرِ محبت ہوں اور ایک نوجوان کو کب سے دل دے بیٹھی ہوں۔

اصغر علی: کیا تمہارا مطلب اُس بڑھئی لڑکے شوکت سے ہے؟ کہاں راجہ بھوج اور کہاں گنگو تیلی۔ تمہارے جیسا نایاب موتی اور گداگر کی جھولی میں۔ کیا تمہیں اپنے بے پناہ حسن کا اندازہ ہے۔

زینب: محبت میں یہ باتیں بے معنی ہیں۔ عشق تو اندھا ہوتا ہے۔ میرا خیال دل سے نکال دیجئے۔

اصغر علی: خدارا کچھ لمحوں کے لئے میرے پاس تو بیٹھ جاؤ۔ تمہارا جی بھر کر دیدار تو کر لیں۔

زینب: یہ ممکن نہیں ہے۔ خدا حافظ۔

(وقفہ)

سلیم: زینب آپ کے کمرے میں آئی تھی۔ کچھ بنی بات؟

اصغر علی: سلیم یہ فاختہ یوں جال میں نہیں آئے گی۔ ہمیں اس بڑھی کو راستے سے ہٹانا ہوگا۔

سلیم: آپ حکم کریں تو اُسے زبردستی بھرتی کر کے دولت آباد بھجوا دیں۔

اصغر علی: نہیں معاملہ بگڑ جائے گا۔ میں نے سوچ لی ہے ایک ترکیب۔

سلیم: بتایئے۔

اصغر علی: ابھی نہیں۔ تم ہو جمال آرا کی محبت میں گرفتار۔ تمہارے منہ سے کچھ نکل گیا تو سارا کھیل بگڑ جائے گا۔ تم جا کر زینب اور جمال آرا سے کہہ آؤ کہ جب شوکت آئے تو ہمارے پاس بھیج دیں۔ ہمیں کچھ کام کروانا ہے۔

سلیم: وہ تو آیا ہوا ہے جناب میں ابھی اُسے لے کر آتا ہوں۔

(وقفہ)

شوکت: سلام جناب۔

اصغر علی: شوکت میاں ہم نے سنا ہے تم بہت عمدہ کاریگر ہو۔ ہمیں ایک چھ بلکہ ساڑے چھ فٹ اور ڈھائی فٹ چوڑا صندوق بنوانا ہے۔ عمدہ لکڑی کا مضبوط ہونا چاہیئے۔ اور کل ہی چاہیئے۔ جو دام لگیں گے وہ ابھی پیشگی مل جائیں گے۔

شوکت: جناب کل تو نہیں مگر پرسوں دوپہر تک پہنچا دوں گا۔ ایک اشرفی کا خرچہ آئے گا۔

اصغر علی: ایک نہیں تم یہ دو اشرفی رکھو۔ اسی میں تمہاری اُجرت آ گئی۔

مضبوط سا لوہے کا تالہ بھی خرید لینا۔ صندوق پر کالا روغن کر دینا۔

شوکت: بہتر جناب۔

(وقفہ)

اصغر علی: شام ہونے والی ہے مگر شوکت صندوق ابھی تک نہیں لایا۔ ہمارے سپاہیوں کی کیا خبر ہے؟۔

سلیم: وہ تو آ گئے جناب اور مسافر خانے کے سامنے کھڑے ہیں کیونکہ صندوق اندر لانے میں اُن کی مدد کی ضرورت پڑے گی۔ شوکت بھی آتا ہی ہوگا۔

(جمال آرا داخل ہوتی ہے)

جمال آرا: بندی سلام عرض کرتی ہے۔ دروازہ پورا کھول دیجئے۔ شوکت اور آپ کے سپاہی صندوق لا رہے ہیں۔ لو وہ آ گئے۔ میں ملتی ہوں۔

اصغر علی: بھئی صندوق تو بہت عمدہ بنا ہے۔ ہاں یہیں بیچ میں رکھ دو اور سپاہیو تم اَب جاؤ۔ شوکت تالا کھول کر دونوں چابیاں مجھے دیدو۔

شوکت: یہ لیجئے تالہ اور چابیاں۔ یہ اندر سے بھی دیکھ لیجئے۔

اصغر علی: لو۔ روغن بھی بالکل سوکھ گیا ہے۔ اب ہم اپنا سامان اس میں رکھ سکتے ہیں۔ ارے مگر ایک غلطی کر گئے۔ ہم نے تو ساڑے چھ فٹ لمبا بنوایا تھا لیکن یہ تو پانچ ساڑے پانچ فٹ ہی لگتا ہے۔ ہاں چوڑائی ٹھیک ہے۔

شوکت: نہیں جناب ایسا نہیں ہو سکتا۔ یہ ساڑھے چھ فٹ لمبا صندوق ہے۔ میں فیتا نہیں لایا ورنہ ناپ کر دکھا دیتا۔

اصغر علی: (ذرا غصے سے) شوکت میاں میری آنکھوں میں دھول نہ جھونکو۔ فوج میں ایسے کام کراتے میری عمر گزر گئی ہے۔ تم خواہ مخواہ اپنی بات پر اڑ رہے ہو۔ سلیم تمہارا کیا خیال ہے؟۔

سلیم: جناب مجھے تو یہ پانچ فٹ لمبا بھی نہیں لگتا۔

اصغر علی: شوکت اسے واپس لے جاؤ اور ٹھیک کر کے لاؤ۔

شوکت: جناب اس کی لمبائی بالکل صحیح ہے۔ کہئے تو ہاتھ سے ناپ کر آپکی تسلی کر دوں؟۔

اصغر علی: تم بہت ضدی آدمی ہوئے ہو۔ کہیں ہاتھوں سے بھی لمبائی ناپتی ہے۔ اچھا یہ بتاؤ تمہارا قد کتنا ہے؟۔

شوکت: پورا چھ فٹ۔

اصغر علی: تو ہاتھ کنگن کو آرسی کیا، تم اس میں لیٹ کر دکھا دو۔ اگر تمہارے لیٹنے کے بعد اس میں دو تین انچ بھی جگہ بچ گئی تو ہم صندوق رکھ لیں گے۔

شوکت: لیجئے میں ابھی اس میں لیٹ کر دکھا دیتا ہوں۔

(شوکت جیسے ہی صندوق میں لیٹتا ہے، اصغر علی صندوق کا ڈھکن بند کر کے تالہ لگا دیتا ہے)۔

سلیم: مان گئے جناب آپ کے دماغ کو۔ اب ساری بات سمجھ گیا۔

اصغر علی: سمجھ گئے تو ٹھیک ہے۔ اب وہ موٹی کیل اور ہتھوڑا اٹھاؤ اور ڈھکن میں ہوا کے لئے چھ سات سوراخ کر دو ورنہ یہ مر جائے گا۔ بھرتی کئے ہوئے آدمیوں کو اکٹھا کرو اور اپنے فوجیوں کو کہو کہ کوتوال سے راہداری لیکر اس صندوق سمیت آج ہی دولت آباد نکل جائیں اور جاتے ہی اس عاشق کو جیل میں ڈال دیں۔ میں آ کر دیکھ لوں گا۔ اور تم دو دن یہاں اور ٹھہر کر اور زینب اور جمال آرا سے اپنی قسمت اپنا کر چلیں گے۔ لو اب جلدی کرو اور صندوق کی یہ چابیاں اپنے سپاہیوں کو دیدنا۔

(دو دن کے بعد)

زینت: جمال آرا آج پورے دو دن ہو گئے مگر میرے شوکت کا کوئی پتہ نہیں کہ زمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا۔ اُس کے گھر والے بھی بہت پریشان ہیں۔ اگر اُس سے کچھ ہو گیا تو میں اپنی جان دیدوں گی۔

جمال آرا: مجھے تو اس موئے اصغر علی پر شک ہے۔

زینب: تو نے میری دل کی بات کہدی۔ یہ دونوں ابھی تک یہاں پڑے ہوئے ہیں۔ کل اصغر علی نے مجھے اشرفیوں کا لالچ دے کر اپنے کمرے میں بلانے کی کوشش کی تھی لیکن میں نے پھٹکار لگادی۔ میرا خیال ہے ان لوگوں نے شوکت کو زبردستی بھرتی کر کے دولت آباد بھجوا دیا ہے۔ اصغر علی نے سوچا ہو گا کہ اگر اُس نے شوکت کو راستے سے ہٹا دیا تو میں اس کی گود میں آؤ گی۔ بدمعاش کہیں کا۔

جمال آرا: تمہارا خیال بالکل ٹھیک ہے۔ کچھ سوچو اور کرو۔ یہ دونوں آج یا کل یہاں سے چلے جائیں گے۔

زینب: جانے دو، میں تو دولت آباد جا کر وہاں کے بادشاہ سے فریاد کروں گی۔ تجھے بھی میرے ساتھ چلنا ہو گا۔

(وقفہ)

سلیم: غضب ہو گیا۔ مجھے جمال آرا نے ابھی بتایا کہ ہم پر شک ہو گیا ہے اور وہ کل محل جا کر ہماری شکایت کرے گی کہ ہم زبردستی یہاں کے آدمیوں کو بھرتی کر رہے ہیں۔ میرے خیال میں ہمیں فوراً دولت آباد چلنا چاہئے۔ میں نے کل کوتوال سے راہداری لے لی تھی۔

اصغر علی: ہاں نکلو فوراً۔ اب جب ہماری آرزوؤں پر ہی پانی پھر گیا تو یہاں ٹھہر کر بھی کیا کریں گے۔ تم اصطبل چل کر گھوڑے کھولو، میں آیا۔ میں نے

بھی اِس زینب کو اغوا کر کے دولت آباد نہیں بلوایا تو میرا نام اصغر علی نہیں۔

(اگلی صبح)

جمال آرا: بی بی زینب غضب ہو گیا۔ وہ دونوں فوجی پیچھے سے بھاگ گئے۔ مسافر خانے کا خرچہ بھی نہیں دے گئے۔

زینب: خرچہ تو وہ پیشگی دے چکے تھے بلکہ ہماری طرف فالتو آیا ہوا ہے۔ مگر یہ تو تیار نکلے۔ اب مجھے یقین ہو گیا کہ شوکت کو وہی اغوا کر کے دولت آباد لے گئے ہیں۔ میں گھوڑا گاڑی کا انتظام کرتی ہوں اور ہم دونوں آج ہی دولت آباد جائیں گے اور بادشاہ سے فریاد کریں گے۔

جمال آرا: اور کوچوان؟۔

زینب: اُس کی ضرورت نہیں۔ میں خود چلاؤں گی۔ پہلے کئی بار چلا چکی ہوں۔ تُو نیچے میرا انتظار کر۔ میں ابھی آئی۔

(زینب گھوڑا گاڑی لے کر آتی ہے اور جمال آرا کو اپنے ساتھ بٹھا کر دولت آباد کی طرف روانہ ہو جاتی ہے)۔

(دولت آباد کے بادشاہ کا محل)

چوبدار: شاہ دولت آباد کا اقبال بلند ہو۔ حضور ریاست نصیر آباد سے دو نوجوان عورتیں فریاد لے کر آئی ہیں اور عالیجاہ سے ملنے کی ملتجی ہیں۔

نواب بخش: نصیر آباد کی عورتیں؟ کیا چاہتی ہیں وہ ہم سے۔ وہ تو ہماری رعیت بھی نہیں ہیں۔ وزیر محل تمہارا کیا خیال ہے؟۔

وزیر محل: حضور کچھ دن پہلے ہماری فوج کے ایک افسر اصغر علی اور سپاہی سلیم نصیر آباد میں بھرتی کے لئے بھیجے گئے تھے اور وہ کل ہی لوٹے ہیں۔ شاید وہ

ان عورتوں کے کسی رشتہ دار کو زبردستی بھرتی کرلائے ہوں۔

نواب امیر بخش: یہ بھی ممکن ہے کہ ہمارے اِن آدمیوں نے ان عورتوں کی بے حرمتی کی ہو۔ خیر چوبداران عورتوں کو ہمارے سامنے پیش کرو اور وزیر محل تم فوراً اصغر علی اور سلیم کو بھرتی کیے ہوئے آدمیوں کے ساتھ ہمارے حضور میں پیش کرو۔ تاخیر بالکل نہ ہو۔

(وقفہ)

زینب: بادشاہ سلامت کا اقبال بلند ہو۔ یہ کنیز نصیر آباد کی زینب حضور کی خدمت میں سلام عرض کرتی ہے۔ یہ میری خادمہ جمال آرا ہے۔ ہم آپ کے دربار میں فریاد لے کر آئی ہیں۔

نواب امیر بخش: لڑکیو تم نہ صرف نوجوان بلکہ بے حد حسین بھی ہو۔ کوئی تعجب نہیں کہ اصغر علی اور سلیم تمہیں دیکھ کر اپنے ہوش وحواس کھو بیٹھے ہوں اور اُن سے کوئی لغزش سرزد ہوئی ہو۔ بولو کیا فریاد لائی ہو۔

زینب: حضور میں نصیر آباد کے ایک بڑھئی لڑکے شوکت سے بے حد محبت کرتی ہوں۔ وہ بھی مجھے چاہتا ہے اصغر علی نے مجھے مسافر خانے میں دیکھا تو اُس کی نیت بدل گئی۔ مگر جب میں نے انکار کر دیا اور اُسے بتایا کہ میں تو اسیرِ محبت ہوں تو اس نے میرے محبوب کو راستے سے ہٹانے کی ٹھان لی اور اُس کو ایک صندوق میں بند کر کے زبردستی دولت آباد بھجوا دیا۔ عالی جاہ مجھ پر رحم کیجئے اور میرے شوکت کو مجھے لٹا دیجئے۔

نواب امیر بخش: اور اے لڑکی تیری کیا شکایت ہے؟ کیا تیرا محبوب بھی ہماری سلطنت میں لایا گیا ہے۔؟

جمال آرا: نہیں حضور میں کسی سے محبت نہیں کرتی۔ آپ کے سپاہی سلیم

نے مجھے اشرفیوں کا لالچ دیکر میری عزت لوٹنے کی کوشش کی تھی۔

چوبدار: حضور کا اقبال بلند ہو۔ عالیجاہ کے حکم کی تعمیل میں مطلوبہ اشخاص لے آگئے ہیں۔

نواب امیر بخش: پیش کئے جائیں۔ نئے بھرتی کئے ہوئے سپاہیوں کو الگ قطار میں کھڑا کیا جائے۔ وزیر محل تم ہمارے پاس رہو۔

(وقفہ)

نواب امیر بخش: اصغر علی اور سلیم تمہیں نصیر آباد نوجوانوں کی بھرتی کے لئے بھیجا گیا تھا نہ کہ عیش کرنے اور رنگ رلیاں منانے۔ زینب کا الزام ہے کہ اصغر علی نے اُس کی جانب پیش قدمی کی اور اُس کے انکار کرنے پر اُس کے محبوب شوکت کو مجرمانہ طور پر اغوا کر کے دولت آباد لایا گیا۔ دوسری لڑکی جمال آرا کا سلیم پر الزام ہے کہ اُس نے اشرفیوں کا لالچ دیکر اُس کی عزت لوٹنے کی کوشش کی۔

زینب: حضور وہ رہا میرا شوکت.....

نواب امیر بخش: (غصے سے) خاموش لڑکی۔ بیچ میں مداخلت مت کر۔ ہماری نظروں نے دیکھ لیا ہے کہ تیرا محبوب کون ہے کیونکہ اُس کی داڑھی بڑھی ہوئی ہے اور اُس کی وردی ڈھیلی ڈھالی ہے اور کسی دوسرے سپاہی کی ہے۔ یہ لوگ شوکت کو قید خانے سے نکال کر اور کسی دوسرے کی وردی پہنا کر ہمارے حضور میں لے آئے ہیں تا کہ ہم دھوکے میں آجائیں کہ یہ بھی جائز طور پر بھرتی کیا ہوا ہے سپاہی ہے۔ شوکت تم بولو کہ تمہارے ساتھ کیا ہوا ہے۔

شوکت: حضور اصغر علی نے دھوکے سے مجھے صندوق میں بند کر دیا اور اس کے سپاہی چوری سے مجھے یہاں لے آئے۔ مجھے یہ لوگ قید خانے سے نکلوا کر یہاں لائے ہیں۔

نواب امیر بخش: اصغر علی تم دونوں کا جرم اور سازش ثابت ہوتا ہے۔ تمہیں اپنے دفاع میں کچھ کہنا ہے؟۔

اصغر علی: جہاں پناہ یہ دونوں عورتیں بدکار ہیں اور اپنے مسافر خانے میں مسافروں کو اپنے حُسن و فریب سے لُوٹتی ہیں۔ یہ جھوٹ بول رہی ہیں اور شوکت بھی جھوٹ بول رہا ہے۔ یہ اپنی رضامندی سے بھرتی ہو کر آیا ہے۔ یہ دیکھیئے بھرتی کے رجسٹر میں اُس کا انگھوٹھا ہے۔

نواب امیر بخش: (کڑک کر) خاموش بے ادب۔ اپنے بادشاہ کو گمراہ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ ہمارے طلب کئے بغیر تُو بھرتی کا رجسٹر لایا ہے تو اس سے مزید ثابت ہوتا ہے کہ تُو آگاہ تھا کہ تیرا جرم کیا ہے۔ وزیر محل ہمارے فیصلے کی فوراً تعمیل ہو۔ اصغر علی اور سلیم کو فوج سے برخاست کر کے چھ ماہ قید بامشقت کی سزا دی جاتی ہے۔ نیز اُن سے سرکاری اشرفیوں کا حساب لیا جائے اور ناجائز طور پر خرچ کی ہوئی اشرفیاں ان سے وصول کر شاہی خزانے میں جمع کی جائیں۔ شوکت کو فوراً رہا کیا جائے اور چونکہ وہ اپنا بڑھئی کا کام نہیں کر سکا' اُسے صندوق میں بند کئے جانے کی تاریخ سے آج تک دو اشرفی فی یوم بطور ہرجانہ دی جائیں۔ ان دو نازنینوں کو آنے جانے کا خرچہ اور زادراہ کے طور پر دس اشرفیاں دی جائیں۔ نیز انہیں ہمارے سپاہیوں کی نگرانی میں اور دن کے اُجالے میں نصیر آباد کی سرحد تک باحفاظت پہنچایا جائے۔ دربار برخاست کیا جاتا ہے۔

کشمیری لال ذاکر

☆

بات کرنے کے لئے ،اپنی زباں مانگتے ہیں
حاکمِ وقت سے کُچھ اور کہاں مانگتے ہیں
ہم کو معلوم ہے،توفیق ِکرم بھی اس کی
جتنا وہ دے نہ سکے ،اُتنا کہاں مانگتے ہیں
پھر بھی اس شخص سے امیدِ وفا باقی ہے
گرچہ معلوم ہے،ہم دل کا زیاں مانگتے ہیں
اُس نے کب ہونے دیا،ہم کو کمی کا احساس
اُتنا مل جاتا ہے،ہم جتنا،جہاں مانگتے ہیں

☆

☆

چلیں گے تھوڑا دَم لے کر، ذَرا سورج نکلنے دو
بدلنے دو ذَرا منظر ، ذَرا سورج نکلنے دو

صفِ ماتم بچھی ہے قتلِ شب پر بزمِ انجم میں
بپا ہے عرصہ محشر، ذرا سورج نکلنے دو

اَندھیرے چند لمحوں میں بساط اَپنی اُٹھالیں گے
بہے گا نُور سڑکوں پر ذَرا سورج نکلنے دو

ابھی چہروں کے خدوخال دُھندلائے ہوئے ہونگے
نہیں واضح کوئی پیکر، ذَرا سُورج نکلنے دو

ہمیں تعبیر بھی تو دیکھنی ہے اَپنے خوابوں کی
مرے ہمدم، مرے دلبر ذرا سُورج نکلنے دو

سنپولے تیرگی کے سرسراتے پھر رہے ہونگے
ابھی ہر سمت سڑکوں پر، ذرا سورج نکلنے دو

کہاں ہیں وہ نئی صبحوں کی تعبیروں کے سوداگر
کہا کرتے تھے جو اکثر، ذرا سورج نکلنے دو

سکڑتے بڑھتے سایوں کے، پھر اَپنوں اور پَرایوں کے
بدلنے والے ہیں تیور، ذَرا سورج نکلنے دو

سفر کرنا ہے جو سورج کی ہمسفری میں ہمسفرو!
تو رُک جا ذرا دم بھر، ذرا سورج نکلنے دو

بڑا ساتھال اُسکے سر پہ کرنوں کا رکھا ہو گا
لُٹانے گا انہیں گھر گھر ، ذرا سورج نکلنے دو

ابھی کھُل جائے گا راہی، بھلا کیا ہے بُرا کیا ہے
وہ رہزن ہے کہ ہے رہبر، ذرا سورج نکلنے دو

○

رنگ محل میں سپنوں کے تمہیں بُلاؤں میں
چھم چھم چھم چھم تم ناچو، گانا گاؤں میں
تاروں کا جھومر پہنے چاند پہ تم ہو ساتھ
چاند ستاروں کی تم کو سیر کراؤں میں
ہم تم جنگل میں ہوں اور شیر نکل آئے
شیر سے جم کر ٹکرلوں، تمہیں بچاؤں میں
میری یاد میں بیٹھی ہو چھت پر تم خاموش
بجاکے سیٹی پیپل سے تمہیں ڈراؤں میں
تھر تھر کانپ اُٹھوں جب میں ٹھنڈے بستر پر
اور اُچانک باہوں میں تم کو پاؤں میں
ہوسکتا ہے لے جائے بیاہ کے تجھ کو غیر
تیرے پتا کی چھاتی پر گولی کھاؤں میں
پگلے کوی کی باتوں کا کیا دے کوئی جواب
کہتا ہے تم سُکھی رہو اور مرجاؤں میں
ڈوبتی کشتی چھوڑ کے تم ہو دو جی میں سوار
بھنور کی گھومتی موجوں میں غوطے کھاؤں میں

●

○

جہت جہت ہے ،خلا ہی خلا کہاں ہوں میں
فلک کا ہے نہ زمیں کا پتا،کہاں ہوں میں
شکستہ قدروں کے بے آسرا مزاروں پر
نہ کوئی پھول نہ روشن دیا،کہاں ہوں میں
یہاں بھی خونِ شہیداں سے تر ہیں ظلم کے ہاتھ
یہ شہر ہے کہ کوئی کربلا، کہاں ہوں میں
عجیب شہر، عجب لوگ، خامشی بھی عجیب
کوئی کسی سے نہیں بولتا ،کہاں ہوں میں
زمیں وآب وہوا جانے موت کب بن جائیں
فنا میں ڈھونڈھ رَہا ہوں بقا کہاں ہوں میں
غرض پرست جہاں کے غرض پسندوں میں
چلا ہوں ڈھونڈھنے مہرو وفا، کہاں ہوں میں
نظر میں رکھا ہے مجھ کو کہ دل میں رکھا ہے
بتا قیام کہاں ہے مرا ،کہاں ہوں میں

●

○

سماعتوں کا ہر اِک تار گنگنا ہے ماں
کہ میں نے تجھ کو فلک پار سے سُنا ہے ماں
جب ایک جسم تھیں تو کتنوں کی تھی قیدی تو
کہ تیرے بعد ترا قرب سوگنا ہے ماں
میں زندگی کو کوئی اور دَھاگے لائی تھی
مگر لباس تو تجھ سا ہی کچھ بنا ہے ماں
تو زندگی ہے تجھے موت کہہ نہیں سکتے
یاں دستِ مرگ نے تیرا بدن چُنا ہے ماں

●

○

مری آنکھوں میں یہ آنسو تری آنکھوں کے ہیں اُماں
مرے دل کے گِرد چھالے ترے پاؤں کے ہیں اماں
مرے خواب پھول سایہ ترے قرب کا کرایہ
مرے گرد کتنے حاکم تری چھاؤں کے ہیں اُماں
مری ماں، مرے سمندر میں تو ریت کا تھی ٹیلہ
جو ہیں چشمِ نم میں دَریا وہ خطاؤں کے ہیں اُماں
نئی ہستیوں کی چھَم چھَم نئی سانسوں کے رُوم سب
سبھی راگ واگ گھنگھرو ترے پاؤں کے ہیں اُماں
مرے قتل کو کھڑے ہیں سبھی رشتوں میں بڑے ہیں
جو ہیں گھیرے تیرے گھر کے ترے گاؤں کے ہیں اُماں
تم جن کی موہ مایا میں قتل ہوگئی ہو
راون یہ کتنی ساری لنکاؤں کے ہیں اماں

عذرا پروین

یہ بارش کون سی مجھ پر مراجپت چور کرتا ہے
یہ کیسا رقص میرے تن کا وہ پور کرتا ہے
مری تہہ تہہ کا تہہ بالا سمندر شور کرتا ہے
یہ کن نظروں سے تو میری کشیدہ ڈور کرتا ہے
مجھے محتاط جینے کیلئے جنگل میں پھنکوا کے
سفر اَرض وسماء کے خود مرا شہ زور کرتا ہے
میری بیداریوں کو نت نئے پنجرے میں کر کے بند
اکیلے کس ہم سفری کا اِتنا شور کرتا ہے
ہے تری نسل ہی کافی مری مرگِ مسلسل پر
تو کیوں مجھ خانہ ویراں پہ صرف زور کرتا ہے

○

یہ زیست کرنے کی نکلی سبیل راتوں رات
میں خود سے ہونے لگا ہوں طویل راتوں رات

نہیں وہ کرسکا آزاد پھر بھی رُوح مری
جوڑھ کے نِکلا بدن کی فصیل راتوں رات

دیا ہے جاگتے تاروں نے بے مہار سا کرب
بنا گئے ہیں مجھے خود کفیل راتوں رات

میں بار بار یہاں زد پہ چڑھتا رہتا ہوں
چڑھائی کرتے ہیں اصحابِ فیل راتوں رات

سروں کو طشت پہ لے کر سحر ہے آنے کی
یہاں سے بھاگ اے ابن السبیل راتوں رات

طیور ناچتے تھے جنکی شاخ شاخ پہ کل
برہنہ ہوگئے ہیں وہ سب تخیل راتوں رات

فریدؔ بھول گیا اَپنا لب ولہجہ اَب
وہ شعر کہنے لگا ہے ثقیل راتوں رات

○

پُرانی روشنیوں کو بجھائے دیتا ہوں
نئے ستارے زمیں پر میں لائے دیتا ہوں

عجیب حال پریشاں ہوں دیکھ لو مجھ کو
کوئی سُنے نہ سُنے میں بتائے دیتا ہوں

مرے وجود کی لَو تھرتھرانے لگتی ہے
یہ کن ہواؤں سے خود کو ڈرائے دیتا ہوں

کبھی کبھی سبھی خوابوں کو رہن کرتا ہوں
کبھی کبھی سبھی قرضے چُکائے دیتا ہوں

گرے اگر مری دستار وہ ہے میری موت
یقیں کرو، نہ کرو میں دکھائے دیتا ہوں

کوئی تو ہے جو چُرانے لگا مجھے مجھ سے
اِس ایک وہم میں اَب غل مچائے دیتا ہوں

بھرے درختوں کو یہ بیل کیسے ڈھانپتی ہے
چلو تمہیں بھی یہ قصّہ سنائے دیتا ہوں

کوئی بتا کے گیا تھا پلٹ کے آؤں گا
اِس اِک اُمید پہ شمعیں جلائے دیتا ہوں

○

بے طرح خوابوں کا دیکھا مجھ کو عادی خوش ہوا
جب کھلی اُس پر مری خوش اعتقادی خوش ہوا

میں نے بھی ظاہر کیا اُس پر نہیں ہوں خود کفیل
دیکھ کر اَبکے وہ میری کم سوادی خوش ہوا

تن بدن میں آگ پھیلاتی ہے اُسکی بانسری
اَپنا کرتب دیکھ کر آتش نہادی خوش ہوا

کس طرح سائے میں سایہ ہوگیا گڈمڈ تھا رات
سارا قصّہ سُن کے یہ خالد عبادی خوش ہوا

صف شکن بادِ مخالف سے نہ آیا اَبکے خوف
بھانپ کر آپ اُپنے میں خود اعتمادی خوش ہوا

میں حدوں کو توڑتا ہوں خود کو پانے کیلئے
وہ سمجھ کر سوچ اِسکو انفرادی خوش ہوا

اِک ذرا بھاتی نہیں اِسکو ہے رنگ آمیزیاں
دیکھ کر میری طبیعت بھی وہ سادی خوش ہوا

لگ گیا اَمرت کے بدلے وِش پلانے پھر فریدؔ
دیکھ کر اِس بات کا مجھ کو وہ عادی خوش ہوا

●

☆

گوہر کی طرح وقفِ تہہِ آب رہیں گے
ہم لوگ تو نایاب ہیں، نایاب رہیں گے

شعلہ سا لپکتے تھے کبھی بزمِ طرب میں
اب عشق میں ہم، نغمۂ مضراب رہیں گے

ساحل پہ رہیں گے تو کریں گے نہ تماشہ
دریا میں مگر، صورتِ گرداب رہیں گے

بادل کی طرح تم کو برسنا ہے دلوں پر
کب تک یہ سمندر یونہی بے آب رہیں گے

مرنے کا سلیقہ جنہیں آتا نہیں وہ لوگ
جینے کے لئے دہر میں بیتاب رہیں گے

وادی سے نہ گزریں گے فقط شور مچا کر
بادل وہی برسیں گے جو پُر آب رہیں گے

☆

☆

شکستہ آئینہ حرفِ دعا کا ہونا تھا
مجھے شکار خود اپنی وفا کا ہونا تھا

یہ اور بات کہ دنیا تھی میری ٹھوکر میں
مجھے اسیر تو اپنی اَنا کا ہونا تھا

زمیں پہ چاند ستاروں کا گو ہجوم سہی
کہ اعتراف تو میرے خدا کا ہونا تھا

میں حرف حرف تجھے آشکار کرتا ہوں
تجھے نقیب مری ہر صدا کا ہونا تھا

یہ بار بار بکھرنا ' سنورنا کیا معنی؟
تجھے مثیل خطِ خوشنما کا ہونا تھا

نہ راس آئی فضا کچھ بھی اس زمانے کی
ہمیں بھی منحرف آب و ہوا کا ہونا تھا

فلک کا قرض چکانا ' زمیں پہ لازم ہے
ہمارے ساتھ بھی اِک کربلا کا ہونا تھا

مسیحِ دہر سے ملتا ہے سلسلہ نوشادؔ
بغیر جرم ہی حامل سزا کا ہونا تھا

انیس امام

☆

چمن میں کام ہے اَب کس کو رنگ و بو سے کوئی
کوئی جو کھیلے ہے زَر سے تو آبرو سے کوئی

رَوِش رَوِش کو جُدا کر کے جیسے چھوڑے گا
لکیریں کھینچ رہا ہے مرے لہو سے کوئی

نوائے شوق کو اَپنی بچا کے رکھ بُلبُل
حسد میں کھیل نہ جائے رگِ گلُو سے کوئی

بس اِتنی بات ہے مرنا بھی سیکھ لینا تھا
گِلہ نہیں مجھے جینے کی آرزو سے کوئی

لہو کے گھونٹ پہ آ کر سِمٹ گئی ہے حیات
رہا نہ خُم سے تعلّق نہ اَب سُبو سے کوئی

مُصر ہیں غنچے کہ پوچھوں یہ باغیاں سے انیسؔ
معاہدہ تو نہیں موت کا عدو سے کوئی

○

غلام نبی ساگر (غافل)

○

آگ لگانے کی یہ عادت تا بہ ہنر بھی پہنچے گی
راکھ بنا کر میرے گھر کو آپ کے گھر بھی پہنچے گی

شعلۂ پا جو بھڑکیں گے تو نوبتِ سر بھی پہنچے گی
خیر کے پیکر گنتے گنتے صورتِ شر بھی پہنچے گی

چشمِ توجہ کب اٹکی ہے کاغذ کی سرسبزی پر
سرخ گلابوں کی ہو تجلی شوخ نظر بھی پہنچے گی

ذہن میں تیرے اے رخِ مشرق دیکھنے والے رہ رہ کر
ظلمتِ شب کی پہنچ گئی تو تابِ سحر بھی پہنچے گی

قصرِ ثریٰ کی گہرائی کیا، رہبرِ نو کا دامن تھام
قافلۂ حق تیری کشتی قصرِ سفر بھی پہنچے گی

طلبِ سمندر کی غرقابی زیرِ آبی سے قطروں کی!
بات یہ خلوت کی اے غافلؔ تا بہ دگر بھی پہنچے گی

●

غلام نبی ساگر (غافل)

○

بحر ہے تو اور لہر بھی تو ہی، طوفان تو گرداب ہے تو
تو کہ سراپا ساحل و منزل، شرط ہے گر بے تاب ہے تو

لوحِ ازل کے اے خطِ رخشاں منظرِ کن کے عکسِ جمیل
مہرِ حقیقت کے چہرے کا گم گشتہ مہتاب ہے تو

ڈوبتے سورج اور ستارے پیچھا ہی کیوں چھوڑیں گے
قیدِ زماں اور قیدِ مکاں میں جب آسودۂ خواب ہے تو

آخر پگھلیں گی بھی کیسے برف کی آہن رَو پرتیں
برفاب ہے درمیانِ عمل، گو آتش بر محراب ہے تو

گم خواب ہیں غافلؔ صدیوں سے برسات بدلاں کچھ آنکھیں
جن کو خبر ہے بس اتنی خوناب ہے خوناب ہے تو

●

اوور بجٹ

کال بیل کی چیخ کمرے کا سکوت منتشر کرتی میرے تخیّل پر ضرب آور ہوئی، ساتھ ہی صفحہ قرطاس پر رُقصاں قلم تھم گئی اور صفحۂ ذہن پر وسوسوں کی قلم تھرکنے لگی۔ خلافِ توقع اِس وقت کون آن دھمکا؟ رُوم بوائے یا گیسٹ ہاؤس کے دِیگر کسی عملہ کا ہونا ممکن نہیں، چونکہ اُنھیں کام کے اَوقات میں ڈسٹرب نہ کرنے کی سختی سے ہدایت دی جا چکی تھی۔ رہا ڈائرکٹر..... وہ رات دیر سے آنے کا کہہ گیا ہے۔ پھر کون ہوسکتا ہے؟ میری قوتِ متخیلہ بیدار ہو جاتی ہے۔ کہیں پروڈیوسر تو نہیں؟ ارے ہاں! آج وہ آنے والا بھی ہے۔ ڈائرکٹر نے تو ایسا ہی کہا تھا.....

ڈائرکٹر کا نام اَمر بھان ہے۔ سو پر فلمز کے پَرچم تلے سَلام الدین اور چندر موہن کی اَوّلین فلم کی اسکرپٹ زیرِتحریر ہے۔ اِس ضمن میں پروڈیوسر نے اَوسط دَرجے کے گیسٹ ہاؤس میں کمرہ بُک کر رکھا ہے۔ جہاں میں پچھلے دو مہینوں سے بلا معاوضہ کاغذ قلم سے سَر کھپا رہا ہوں۔ معاوضہ کے تقاضے پر ڈائرکٹر خوش اُسلوبی سے بہلا دیتا ہے۔

اَب کال بیل کے ساتھ ساتھ کواڑ پر تھاپ سنائی پڑتی ہے۔ میں ہربڑا کے اُٹھ کھڑا ہوتا ہوں اور لپک کر لیچ ٹرن کرتا ہوں۔ دَروازہ کھلتے ہی ڈائرکٹر اور پروڈیوسر پر نگاہ ٹھہرتی ہے۔ دونوں شاپنگ بیگ سے لدے پھندے مُجھے گھور رہے ہوتے ہیں۔ اُن کے عقب سے ایک نوخیز دوشیزہ برآمد ہوتی ہے جو بَرائے نام لباس زیبِ تن کئے ہوتی ہے میں اِن سبھوں پر طائرانہ نگاہ ڈالتے ہوئے آداب بجالاتا ہوں۔ پروڈیوسر خشمگیں نگاہوں سے تکتے ہوئے مجھ سے استفسار کرتا ہے۔

''سو رہے تھے کیا؟''

''نہیں تو.....''

''پھر دروازہ کھولنے میں اتنی دیر.....؟'' کہتے ہوئے آگے بڑھتا ہے۔ ساتھ ساتھ وہ دونوں بھی اندر داخل ہوتے ہیں..... ڈائرکٹر بیڈ پر بیٹھ کر شاپنگ بیگ سے ملبوسات نکال نکال کر پُر اشتیاق نگاہوں سے دیکھتا ہے۔ پروڈیوسر ایزی چیئر پر پسر جاتا ہے۔ دوشیزہ ڈائرکٹر کے پہلو نشین ہو جاتی ہے۔ ڈائرکٹر بیگ سے جُوتوں کا بکس نکالتے ہوئے گویا ہوتا ہے۔

''شوبڑا بند اس بلا ہے سلام بھائی۔ ایسے ہی شوز ڈائرکٹر کی ڈیگنیٹی (Dignity) ظاہر کرتے ہیں'' پروڈیوسر چہک کر اُٹھ بیٹھتا ہے۔ ''امر بھائی ہے بھی تو دو ہزار کا..... کچھ بھی بولو اَب تک کی زندگی میں تم نے اِتنے قیمتی جوتوں کے بارے میں سوچا تک نہ ہوگا..... پھر یار تم ہماری فلم کے ڈائرکٹر ہو..... ہم ڈائرکٹر بنائینگے تبھی تو ہمیں بتاؤ گے..... کیوں شرمیلی جی؟''

''دوشیزہ بجائے کچھ کہنے کے دانتوں کی نمائش کرتی ہے.....

''شرمیلی ..... یہ کاسٹیوم پہنو تو..... دیکھیں کیسی لگتی ہو۔ ڈائرکٹر کی فرمائش پر وہ کاسٹیوم لے کر دیکھتی ہے۔ ''سر یہ تو سوئمنگ کاسٹیوم ہے''۔

''آئی نو..... بٹ میں تمہارا فگر دیکھنا چاہتا ہوں۔''

''وہ تو آپ اس کے بغیر بھی.....!'' کہتے ہوئے لپک کر بیڈ پر کھڑی ہو جاتی ہے۔ اور آن کی آن میں جسم سے لباس یوں اُتار پھینکتی ہے۔ جیسے ہم آپ کیلا چھیل کر چھلکا پھینک دیتے ہیں۔ ڈائرکٹر اُٹھ کر اُس کے جسم کے نشیب و فراز کا جائزہ لیتا ہے۔ اور اُسے دوبارہ بالباس ہونے کا حکم صادر کرتے ہوئے پروڈیوسر سے مخاطب ہوتا ہے ''سلام بھائی فگر وائز شرمیلی ہیروئن کے لیے بلکل فِٹ ہے۔ سائن کر لو۔ اَدر وائز (otherwise) کسی اور پروڈکشن نے پہلی کر دی تو.....''

ارے بھائی میں نے کب اِنکار کیا..... پھر ہماری پروڈکشن کے کرتا دھرتا تو تم ہی ہو۔''

تھینک یو..... تھینک یو'' ڈائرکٹر کی باچھیں کھِل جاتی ہیں۔ پھر آن کی آن میں سائننگ

لیٹر کی خانہ پُری ہوتی ہے۔ اور پانچ ہزار نقد لفافہ میں رکھ کر بصد خلوص اسے پیش کیا جاتا ہے.....وہ غازہ ملے چہرہ پر خوشیوں کی سُرخی بکھیرتی لفافہ قبول کر کے پروڈیوسر سے ہاتھ مِلا کر شکریہ اَدا کرتی ہے اور ڈائرکٹر کے چَرن چُھوتی ہے۔ میری جانب مُڑتی ہے تو جانے کیوں میں اُسے متاسف نِگاہوں سے تکتے ہوئے سوچتا ہوں۔ کاش میں بھی ہیروئن ہوتا.....!

پھر ڈائرکٹر زیرِ لب مُسکراتے ہوئے پروڈیوسر سے کہتا ہے۔ ''ارے بھائی آپ کی ہیروین سائن ہوگئی موقع خوشی کا ہے۔ اَب تو شراب اور کباب کا ایک دَور چلنا ہی چاہئے۔ کیوں شرمیلی جی؟''.....

''ایس یوش'' (As you wish) شرمیلی شانے اُچکاتی ہے..

''منگوالو بھائی''..... پروڈیوسر پژمردہ لہجہ میں گویا ہوتا ہے۔ ڈائرکٹر فوراً انٹرکوم پر آرڈر نوٹ کراتا ہے.....اِس سے قبل کہ شراب کا دور شروع ہو میں ڈائرکٹر سے مخاطب ہوتا ہوں.....''امر بھائی''!.....

''کیا ہے؟'' وہ ناگواری ظاہر کرتا ہے....

''ایک منٹ ذرا.....'' جُملہ پُورا ہو بھی نہیں پاتا کہ وہ کرخت لہجہ اَپنا لیتا ہے۔

''دیکھو اِس وقت میں بہت ہی اَچھے مُوڈ میں ہوں''.....

''لیکن اَمر بھائی.....میں تو.....!'' وہ سُنی اَن سُنی کر کے پروڈیوسر سے مخاطب ہو جاتا ہے۔ ''ہاں تو مسٹر پروڈیوسر اَب آپ کا اگلا پروگرام کیا ہے؟''

شراب سے حلق تر کرینگے اور تین چار ہزار روپیوں کا سوگ مناتے گھر لوٹ جائیں گے''.....

''واہ.....کیا ڈائیلاگ ہے''.....ڈائرکٹر ٹھہا کا لگاتا ہے.....''یار تمہیں پروڈسر نہیں ڈائیلاگس رائٹر ہونا چاہئے تھا.....

''لاحول بھیجو یار.....ڈائریکٹر جھنجھلا جاتا ہے.....''پانے کے لئے کچھ کھونا پڑتا ہے سلام بھائی.....قربانی دینا ہوتی ہے.....

خواہشوں، تمناؤں کا گلا گھونٹنا پڑتا ہے..... بھوک پیاس کا مرڈر کرنا ہوتا ہے''۔ ایک ہی سانس میں کہتا جاتا ہے۔ اسی دوران دروازے پر دستک ہوتی ہے' پروڈیوسر ہانک لگاتا ہے۔

''آجاؤ بھائی''..... دروازہ کھلتا ہے۔ رُوم بوائے بڑے سے قاب میں پینے پلانے کے تمام لوازمات لئے وارد ہوتا ہے اور بڑے ہی اہتمام سے ٹیبل پر ایک ایک چیز چن دیتا ہے۔ پھر بوتل کی کاگ کھولتے ہوئے استفسار کرتا ہے۔ ''ساب اور کچھ؟''..... ڈائرکٹر پروڈیوسر کی جانب سوالیہ نگاہوں سے تکتا ہے۔ پروڈیوسر سر نفی میں سر کو جنبش دیتا ہے۔ رُوم بوائے کمرے سے جانے کو ہوتا ہے کہ شرمیلی آواز دیتی ہے ''ٹھہرو!'' پھر مجھ سے مخاطب ہوتی ہے... ''رائٹر صاحب!''

''جی!'' میں لکھتے لکھتے نگاہ اُٹھاتا ہوں.....

''کچھ لینگے آپ؟''

جی..... میں شراب نہیں پیتا''.....

''آئی نو..... بٹ سافٹ ڈرنک تو لے ہی سکتے ہو؟''

''کیا! سافٹ ڈرنک؟'' ڈائرکٹر بے ساختہ بول پڑتا ہے..... ''اوُپ شرمیلی تم بھی کمال کرتی ہو۔ رائٹرس کی خوراک چائے ہوتی ہے چائے.....''

''ساب چالُو چائے کیا پیشل؟'' رُوم بوائے استفسار کرتا ہے۔

اَبے پیشل لا..... پروڈیوسر جھنجھلا جاتا ہے۔ ''چالُو چائے بھی کوئی چائے ہوتی ہے۔''

.....رُوم بوائے پورا جُملہ سنے بغیر کمرے سے نکل جاتا ہے۔ شرمیلی بیڈ پر بیٹھے ہی بیٹھے ساقی بن جاتی ہے اور ڈائرکٹر پروڈیوسر کو گھورنے لگتا ہے۔ لیکن پروڈیوسر پر اس عمل کا کوئی ردعمل نہ پا کر اَندر ہی اَندر پیچ و تاب کھانے لگتا ہے' پھر نگاہیں اُٹھائے بغیر کہتا ہے..... ''سلام بھائی..... ایک بات اچھی طرح ذہن میں نوٹ کرلو کہ کسے چالُو کسے پیشل چائے دینا ہے۔ یہ میرا لک آؤٹ ہے..... اگر ایسے ہی تمہیں حاتم طائی کی اَولاد بننے کا شوق چراتا رہا تو بجٹ آگے بھاگے گا اور فلم اُوور بجٹ ہو جائیگی۔''

''کیا!''..... شرمیلی چونک پڑتی ہے اور اس کے ہاتھ سے شراب کی بھری بوتل فرش

پر گر کر چھنا کا پیدا کرتی ہے۔ اِس چھَنا کے میں شرمیلی کے لبوں سے ''سوری'' اور بہ یک وقت ڈائرکٹر اور پروڈیوسر کے ہونٹوں سے ''کوئی بات نہیں'' پھسلتا ہے۔ شرمیلی سہمے ہوئے لہجہ میں غالباً سرگوشی کرتی ہے۔

''لیکن سَر فلم کا بجٹ؟''

☆

ملک کے

نامور علمی اور ادبی اداروں کی کتابوں کے

ساتھ ساتھ کلچرل اکیڈیمی کی مطبوعات خریدنے

کے لئے تشریف لائیں

کتاب گھر

مولانا آزاد روڈ سری نگر / کنال روڈ جموں / فورٹ روڈ لیہہ لداخ

☆

یٰسین احمد☆

چاہت کے رنگ

وہ وقفہ وقفہ سے تین دفعہ میرے شوروم میں آئی تھی۔ پہلی دفعہ جب آئی تھی تب اکیلے نہیں تھی۔ ساتھ ایک اور عورت بھی تھی۔ تقریباً اس کی ہم عمر' بیس اکیس سال کے درمیان۔ اس کے خدوخال دلکش اور متناسب تھے۔ جسم پر سیدھی سادھی پوشاک جسے دیکھ کر اندازہ ہو جاتا تھا کہ اسکی مالی حالات مستحکم نہیں ہے۔ بس پسی جارہی ہے جینے کی جستجو میں۔

اس دن اس نے کوئی خریداری نہیں کی۔ اس دن سونے کا بھاؤ دریافت کیا۔ شوروم میں سجے ہوئے ہمہ اقسام کے زیورات پر ایک اچٹتی ہوئی نظر دوڑائی اور باہر نکل گئی تھی۔ میرے لئے یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ دکان میں داخل ہونے والا ہر فرد خریدار نہیں ہوتا۔ برسوں کا تجربہ یہی بتاتا ہے۔ جب کوئی فرد شوروم میں آتا ہے تو میں اندازہ لگالیتا ہوں کہ وہ کچھ خریدے گا بھی نہیں۔

سونے کی خرید وفروخت کا کاروبار ورثا میں مجھے ملا ہے۔ بچپن سے اس کاروبار میں ڈوبا ہوا ہوں۔ جہاں میرا شوروم ہے وہ شہر کا ایک مصروف ترین کاروباری علاقہ ہے۔ دوسری دفعہ جب شوروم میں آئی تھی تب وہ اکیلی تھی۔ کندھے سے ایک پرس لٹک رہا تھا۔ مہینے کی ابتدائی تاریخ تھی۔ گمان اغلب تھا کہ اُس کے پرس میں خاصی رقم موجود ہوگی۔ وہ ایک مردانہ برسلیٹ خریدنا

☆جواہر پورہ، پوسٹ یاقوت پورہ، حیدرآباد (اے پی) ۲۳

چاہتی تھی جو خوب سے خوب تر ہو۔ سیلز مین نے نت نئی ڈائزس کے کئی برسلیٹ اس کو بتایا۔ میں اپنے کاونٹر پر بیٹھا اسکے سراپے کا جائزہ لیتا رہا۔ اس نے کوئی زیور نہیں پہن رکھا تھا۔ کانوں سے پرانی وضع کے یرنگنس (Earengs) لٹک رہے تھے جو آوٹ آف فیشن ہو چکے تھے۔ دیر تک دیکھنے پرکھنے کے بعد اُس نے جس برسلیٹ کا انتخاب کیا تھا اسے دیکھ کر میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ وزن اور قیمت کی اعتبار سے برسلیٹ کافی مہنگا تھا۔ مجھ کو یقین تھا کہ اتنا مہنگا برسلیٹ وہ نہیں خریدے گی۔

چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ سیلز مین نے جیسے ہی اُس برسلیٹ کی قیمت بتائی' اسکے چہرے پر یک لخت مایوسی چھا گئی اور آنکھوں کے چراغ بجھ گئے۔ اُس نے آہستگی سے کہا۔ ''یہ تو کافی مہنگا ہے''۔

''کوئی دوسرا زیور پسند کر لیں' کم وزن والا''۔ سیلز مین نے مشورہ دیا لیکن یہ مشورہ اس کے دماغ میں نہیں اُترا۔ جب نگاہ انتخاب بڑھیا چیزوں پر جمی ہو تو کمتر چیزیں کہاں بھاتی ہیں؟ وہ تھوڑی دیر تک کھڑی سوچتی رہی اور پھر 'سوری' کہہ کر باہر نکل گئی۔

آج تیسری دفعہ وہ شوروم میں داخل ہوئی تھی تو گھبرائی گھبرائی سی لگ رہی تھی۔ بار بار چہرے کا پسینہ پونچھ رہی تھی۔ وہ سیدھا اس سیلز مین کی طرف بڑھ گئی جس نے پچھلی دفعہ اس کو برسلیٹ دکھایا تھا۔ وہاں پہنچ کر اس نے اپنا پرس کھولا۔ پرس سے ایک مڑے ہوئے کاغذ کے پرزے میں لپٹا ہوا زیور نکال کر سیلز مین کی طرف بڑھایا۔ میری نگاہ فوراً اس کے کانوں کی طرف اٹھ گئی۔ اس کے کان خالی تھے۔ اس کی گھبراہٹ کی وجہ سمجھ میں آ گئی۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اچھے دنوں میں کوئی چیز خریدی جاتی ہے۔ اور بعد میں ناگزیر حالات کی بنا اس چیز

کو بیچنے کی نوبت آتی ہے تو ندامت سی محسوس ہوتی ہے۔ وہ یرنگس بیچ کر ایک انگوٹھی خریدنا چاہتی تھی۔ برسلیٹ خریدنے کا خیال دماغ سے نکل چکا تھا۔ اس نے ایک خوبصورت سی انگوٹھی پسند کی جو وزنی تھی جبکہ یرنگس کا وزن کم تھا۔ میل اور کھوٹ منہا کر دینے کے بعد اس کو مزید پانچ سو روپے ادا کرنا تھا۔ دونوں زیور کا حساب کتاب جوڑنے کے بعد جب سیلز مین نے یہ بات بتائی تو وہ تکرار پر اُتر آئی۔ وہ مزید رقم دینے کے لئے تیار نہیں تھی۔

میرے جتنے سیلز مین ہیں وہ انتہائی گھاگ ہیں۔ جس کا نمک کھاتے ہیں اُس کا گھاٹا کرنا دو کی بات ہے، ہمیشہ گاہک سے معقول نفع بٹورنے کی سوچتے ہیں۔ سیلز مین نے رٹے ہوئے کاروباری فقرے دوہرائے۔ ''آپ سیٹھ صاحب سے بات کرلیں۔''

سیلز مین نے مجھ کو مخمصے میں ڈال دیا تھا۔ عورت کے چہرے پر جو معصومیت تھی امید و بیم کی جو کیفیت تھی وہ مجھ کو سودے بازی سے روک رہی تھی۔ یوں بھی اگر میں اس سے مزید رقم نہ بھی لیتا تو گھاٹے میں نہیں تھا۔ تھوڑی بہت کمائی ہو رہی تھی۔ میں نے اسی پر اکتفا کیا اور انگوٹھی اس کے حوالے کر دی۔

مسکراتی آنکھوں سے اپنے سر کو ذرا سا خم دے کر بولی۔ ''شکریہ''

میں نے غور سے اس کی آنکھوں میں دیکھا جہاں محبتوں کا ایک وشال سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ ''آپ نے بہت اچھی انگوٹھی پسند کی ہے۔ لوگ عموماً گفٹ میں ایسا زیور نہیں دیتے۔''

اس کا چہرہ گلنار ہو گیا مگر اس نے کسی قسم کی وضاحت نہیں کی۔ میرے ذہن میں ایک ان دیکھے، انجانے نوجوان کا سراپا اُبھر آیا جس کے لئے اس نے تحفہ پسند کیا تھا۔ جو اس کا منگیتر ہو سکتا تھا۔ محبوب ہو سکتا تھا۔

اس بازار میں ہر روز ان گنت گاہک آتے ہیں اور چلے جاتے ہیں۔ دیر تک کوئی چہرہ دماغ میں محفوظ نہیں رہتا۔ وہ عورت بھی میرے ذہن سے نکل گئی۔ کئی دن بیت گئے۔

ایک روز صبح کے وقت ایک نوجوان میرے شوروم میں داخل ہوا۔ صبح کے وقت عموماً گاہک کم رہتا ہے۔ اس وقت دُکان خالی تھی۔ وہ نوجوان سیدھا میرے قریب چلا آیا۔ حالانکہ میرے لئے وہ اجنبی تھا لیکن مجھ کو ایسا لگا کہ اس کا چہرہ جانا پہچانا ہے؟

اس نے اپنے جیب سے ایک چھوٹی سی پلاسٹک کی ڈبیہ نکالی۔ ڈبیہ میں سے جو چیز برآمد ہوئی تھی وہ ایک انگوٹھی تھی۔ ''میں یہ انگوٹھی فروخت کرنا چاہتا ہوں۔''

میں نے فوراً انگوٹھی پہچان لی۔ انگوٹھی پر میرے شوروم کے نام کا ٹھپہ لگا ہوا تھا فوراً میری آنکھوں کے سامنے اس عورت کا چہرہ ابھر آیا جس نے یہ انگوٹھی خریدی تھی۔

ایک لمحہ کے لئے خیال آیا کہ شاید عورت کو فلرٹ کر رہا ہے؟ کتنی چاہت اور تگ و دو کے بعد اس عورت نے انگوٹھی خریدی تھی اسکا اندازہ لڑکے کو نہیں تھا۔ پیار کرنے والے تو چاہت کی نشانیوں کو دل میں دفن کر لیتے ہیں۔ لیکن وہ چاہت کی اس نشانی کو بازار کی نذر کر رہا تھا۔ مجھے اچھا نہیں لگا۔ لیکن قبل اس کے کہ میں کچھ کہتا وہ تھوڑی جھجک کے ساتھ بولا۔

'' مجھ کو اس انگوٹھی کے بدلے پیسے نہیں چاہئے۔ ایک ریننگس دے دیجئے۔ اس انگوٹھی کے وزن اور قیمت کے لگ بھگ۔۔!''

☆★☆

عظیم راہی☆

منظروں کا زوال

آج شاپنگ سینٹر میں اچانک اس سے ملاقات ہوئی۔ ایک پل کے لئے جب اس سے آنکھیں چار ہوئیں تو اس کی آنکھوں میں وہی مخصوص چمک نظر آئی جو کبھی میری تسکین کا سبب ہوا کرتی تھی۔ اُسے دیکھ کر یوں لگا جیسے وقت معارک گیا ہو۔ سب کچھ تھم گیا ہو۔۔۔۔۔۔۔۔۔ بالکل ٹھہر سا گیا ہو۔ لیکن دوسری ہی پل اس منجمد لمحے کو زندگی کی اس کڑی حقیقت نے جیسے پگھلا کر بڑی بے رحمی کے ساتھ مجھ پر یہ ظاہر کر دیا کہ ہم دونوں اب نہ تو پہلے جیسے رہے اور نہ ہی یہ دنیا ہمارے لئے پہلے جیسی رہی تھی۔ سب کچھ بدل گیا تھا۔ وقت اور حالات کی گردش نے تغیرات کی ایک نئی دنیا بسا دی تھی کہ اب اس کے ساتھ اس کا شوہر تھا اور میرے ساتھ میری بیوی۔ شاید اس لئے بھی، اور برسوں بعد ملنے کے سبب ایک بار پھر تعارف ہوا۔ تجدید ملاقات کا اشتیاق بھی بڑھا۔ وہ مجھ سے بہت کچھ پوچھنا چاہتی تھی اور میں بھی اس سے ڈھیر سارے سوالات کرنا چاہتا تھا لیکن دونوں ہی طرف سکوت طاری تھا۔

خاموشی بدستور ہمارے اطراف چھائی رہی جبکہ ماحول میں ہر طرف شور کا سیلاب اُمڈ آیا تھا۔ چہل پہل، رونق، بھیڑ، ہجوم سب معمول کے مطابق جاری وساری تھے جو شور وہنگاموں کو بڑھاوا دے رہے تھے۔ ہمارے اطراف پھیلے ہوئے

☆ بلاک نمبر ۳۸ - ایم ایچ بی کالونی، شاہ بازار، روشن گیٹ، اورنگ آباد (مہاراشٹر)

بتدریج بڑھتے ہوئے اس شور نے کچھ کہنے کا موقع فراہم کیا کچھ کہنے کے لئے میرے لب کھلے مگر، قوتِ گویائی سے محروم ہوکر اور میں اپنے اندر ہی کچھ بولتے ہی جیسے خاموش ہوگیا تو باہر کا شور میرے اندر پھیل گیا۔ اس ماحول میں یکا یک ہمارے درمیان رسمی گفتگو شروع ہوگئی۔ اس کے شوہر نے بظاہر گرمجوشی کا مظاہرہ کیا۔ بڑے پرتپاک سے ہاتھ ملایا اور خیریت بھی پوچھی لیکن مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اسے میرا ملنا عجیب سا لگا ہو۔ ویسے بھی کسی اجنبی شخص سے مل کر خوشی کم ہی ہوتی ہے۔ ادھر میری بیوی جو بہت دیر سے میرے چہرے کو بغور پڑھ رہی تھی۔ اور اس کی چھٹی حس نے اپنا کام شروع کر دیا تھا اس کی تاڑنے والی نظریں کسی قیامت سے کم نہیں تھی۔ وہ میری چور نظروں کو اپنی شک کی نگاہوں سے جانچ رہی تھی اور میں چاہتے ہوئے بھی کچھ کہہ نہیں پا رہا تھا۔ مگر آنکھوں کے سامنے گزرے لمحات کے وہ سارے مناظر کسی فلم کی طرح ذہن کے اسکرین پر ابھرنے لگے تھے کہ ہر انسان کی زندگی میں یادوں کی ایک کتاب ضرور ہوتی ہے جو ماضی کے سوا اور کیا ہوسکتی ہے! کسی نے سچ ہی کہا ہے کہ جس کا ماضی نہ ہو شاید اس کا کوئی حال بھی نہیں ہوتا کہ حال تو ہمیشہ ہی اپنے ماضی سے جڑا ہوا ہوتا ہے اور یہی حال اپنے مستقبل کے آنگن میں آس کے گروندے سے بناتا رہتا ہے۔ شاید اسی لئے گزرے ہوئے لمحوں کے وہ سارے قصے پھر زندہ ہوگئے اور دل کے آشیانے میں ان رفاقتوں کے پرندے پل بھر میں اُڑان بھرنے لگے۔ اس سے بچھڑنے کی گھڑی یاد آئی اور جدا ہونے کا کرب ناک منظر آنکھوں میں کسی زہریلی گیس کی طرح پھیل گیا اور پھر سب کچھ یاد آگیا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ والد کی علالت، علالت سے سنبھالا لیکن ذرا صحت اور پھر اچانک ان کی رحلت، مگر میرے اندر کی دوستی کو رشتہ داری میں بدلنے کی خواہش زندہ، جیسے پورا کرنا میری ذمہ داری اور

اس کی تکمیل میرا فرض بن گیا۔ ساتھ ہی دن بدن ذمہ داریوں کا بڑھتا ہوا بوجھ اور عملی زندگی کے دشوار کن مراحل' ان میں محدود کر دینے والی مجبوریاں مجھے توڑ گئیں اور پھر میں اپنے والد کے خوابوں کی تکمیل میں بس یوں منہمک ہو گیا کہ ان سب میں گھر کر کہیں کھو گیا۔ جیسے سب بھول گیا۔ اپنی خواہش بھی' ذمہ داریوں کے بندھن میں کب کی کسی اور کی بن چکی ہے نہیں۔ شاید بنا دی گئی تھی۔ مگر میرے ساتھ تو یہی سب ہوا تھا۔ نہیں' شاید ہم دونوں کے ساتھ' دونوں ہی دھیرے دھیرے اپنے اپنے حالات کے سبب ایک عجیب سی بے یقینی کے عالم میں مگر فیصلہ کن طور پر ایک دوسرے سے یوں دور ہوتے چلے گئے تھے کہ وقت کی گود میں دوبارہ واپسی کا کوئی امکان نہیں رہا تھا۔ نزدیکی کا کوئی تصور نہیں کیا جا سکتا تھا۔ البتہ یہ بات اور تھی کہ میں گزرے ہوئے وقت کے ان سارے لمحوں کو اپنی زندگی میں واپس لانا چاہتا تھا۔ مگر کیسے یہ مجھے ہرگز معلوم نہ تھا اور اگر معلوم ہوتا بھی تو وہ میرے اپنے بس میں' میری اختیار میں کیا تھا جو کچھ کر پاتا۔ شاید کسی طرح ممکن ہی نہیں رہا تھا کہ میں کچھ کر سکتا۔۔۔۔ اور آج اس سے یوں اچانک ملنے پر' ان ہزاروں بیتے دنوں کی لاکھوں باتیں یادیں بن کر میری سارے وجود میں مچل مچل گئیں۔ روم روم میں سما گئیں۔ اور ان بے اختیار سب کچھ پل بھر میں آنکھوں کے سامنے پھیل گیا۔

یونیورسٹی کی وسیع اور عریض رقبے پر پھیلی عمارت' بڑے لان اور دور دور تک پھیلے ہوئے سبزے بھرے میدان' ان کے اطراف باغ اور باغیچے اور ان میں ہر طرف گھاس کے غالیچے اس ماحول میں بے شمار طلباً و طالبات لیکن ان سب سے جدا سب سے الگ۔ اپنی دھن' اپنا نغمہ اپنی جستجو' ہر وقت ساتھ ساتھ رہنے کی آرزو' ساتھ مل کر پڑھنے کی خواب اور پھر ایسے میں تمہارے ان گنت

سوالات بس مجھ سے مسلسل کچھ نہ کچھ پوچھتے رہنے کا مشغلہ اور میری تم سے بحث میں الجھنے کی فطرت مجھے الجھتا ہوا دیکھ کر بڑی خوشی اور شرارت سے مجھے تمہارا چھیڑتے رہنا اور میرا پیار سے مسکرا دینا۔ پھر تمہاری جی بھر کر خوش ہونا تمہیں اس طرح مسکراتا ہوا خوش ہو کر مسرت لبریز دیکھ کر میرا اپنی ساری الجھن کو بھول جانا۔ اسی ماحول میں خوشی کے نشے میں سرشار، پھر ہم دونوں کے قہقہے دور دور تک سارے اطراف میں پھیل جاتے جو ساری فضا کو خوشگوار بنا دیتے اور ہمارے اطراف محبت اور اپنایت کی خوشبوئیں بکھر بکھر جاتیں۔

ماضی کی دُنیا سے ذرا نکلا تو دیکھا اس کے شوہر کی نگاہیں مجھ پر تھیں مگر اس نے مجھے یوں دیکھا گویا اسے لگا کہ کہیں دبی راکھ میں کوئی چنگاری اب بھی باقی ہو۔ جو شاید ملاقات کی ہوا سے شعلہ نہ بن جائے کہ کبھی کہیں آگ تھی۔ لگا پھر ماضی کے وہ سارے منظر ایک بار بکھر گئے ہوں..... ''بڑے سے پیڑ کے نیچے میں اور تم، تم اور میں میری باتیں تمہاری دلفریب گفتگو، جی لبھانے والی مسکراہٹیں اور پھر تمہارے کبھی نہ ختم ہونے والے سوالات، ریختہ سے ریختی تک گفتگو، غالبؔ کی ڈومنی اور فانیؔ کی ایک طوائف سے محبت پر بحث، داغؔ کی منی جان سے عشق و محبت پر بات چیت، اقبال کے عطیہ فیضی کے نام خطوط کا ذکر، جوشؔ کی رومان پرور شاعری کے پس منظر پر گفتگو، فیضؔ اطالوی محبوبہ کا ذکر، اختر شیرانی کی سلمیٰ کا تذکرہ، اور کبھی واسوخت کی باتیں تو کبھی پھر وہی ریختہ اور ریختی کا پُرانا قصہ، لائبریری میں ہو یا کنٹین، کلاس روم ہو یا اس کے اطراف کا ماحول، تمہاری یہی ایک گفتگو، بس یہی ایک موضوع، یہی ایک بات، اسی ایک موضوع کے تحت ایسے کتنے ہی تذکرے، نہ جانے کتنی ہی کہانیاں اور کتنے ہی ایسے قصے جنہیں سن کر میں مبہوت ہو کر رہ جاتا اس دوران تجسّس کا ایک عجیب سا عالم تم پر چھایا رہتا۔ ایسے میں، میں

سب کچھ بھول کر کہیں کھو جاتا اور پھر میں اکثر سوچتا اور تم سے پوچھنا بھی چاہتا کہ ''آخر تم ان متنازعہ موضوعات پر ہی کیوں گفتگو کرنا چاہتیں ہو۔ یہی کیوں ہر وقت پوچھتی رہتیں ہو۔ ان عظیم فنکاروں کی نجی زندگی کے بارے میں جان کر ان کی زندگی کے ان مخفی گوشوں سے ہمیں کیا لینا دینا..... تم اگر اس موضوع پر ہی بات کرنا چاہتیں ہو کچھ پوچھنا بھی چاہتیں ہو تو ان کے فن پر بات کرو''۔ لیکن ہر بار تمہاری اسی ایک بات پر اصرار' یہی ایک سوال اور اسی ایک سوال کی مسلسل تکرار' تم اپنی عادت سے مجبور' تمہاری اس خواہش پر میں اکثر خود کو بے بس پاتا مگر میری بے بسی دیکھ کر تمہارے اندر اسی طرح کی سوالات' پوچھنے کی جستجو اور بڑھ جاتیں تمہیں جان لینے کی تگ ودو میں تم اکثر گہرے خیالوں میں ڈوب جاتیں' سوچ کے طویل سلسلوں میں کھو جاتیں اور میں تذبذب کا شکار ہو جاتا اور ایک عجیب سی صورت حال سے دوچار رہتا''۔

''نوید صاحب' آیئے کہیں چل کر بیٹھتے ہیں اور چائے پیئیں گے''۔ اس کے شوہر کی آواز پر یکا یک میرے خیالات کا تسلسل پھر ٹوٹ گیا ''ہاں چلیئے نا'' میں یہ کہنے والا ہی تھا۔ آپ نے میرے منہ کی بات چھین لی۔ میں اپنی خفت مٹانے بے اختیار کہہ اٹھا۔

میری اس بوکھلاہٹ پر میری بیوی ہنس دی اور وہ مسکرا اُٹھی۔ اسے یوں مسکراتا ہوا دیکھ کر میں اندر ہی اندر جھوم اُٹھا' خوابوں کے دریچے پھر ذہن میں واضح ہونے لگے۔ بکھرے منظر سمٹ سمٹ کر آنکھوں کے دائروں میں پھر ایک ہونے لگے اور پھر سب کچھ عیاں ہونے لگا اور پھر ایک بار میں ان سب میں کھو گیا۔ نہیں' شاید گم ہو گیا۔ ایسے میں ایک کپ چائے آئی۔ پتہ ہی نہ چلا۔ جب چائے ٹھنڈی ہونی لگی تو اس نے کچھ ایسی نظروں سے دیکھا جیسے کہہ رہی ہو۔

''خوب' باتیں کرتے کرتے کہیں کھو جانے کے شوق میں' چائے ٹھنڈی کر دینے کی عادات اب تک نہیں بدلی''۔

اور میں نے سوچا۔''عادتیں اور خیالات کہاں بدلتے ہیں۔ ہاں' حالات ضرور بدلتے ہیں یا پھر سن کچھ بدل کر رکھ دیتے ہیں جیسے اب میں اور تم' تم اور میں میرے ساتھ میری بیوی اور تم اپنے شوہر کے ہمراہ' مگر ہم تم اب کیسے اجنبیوں کی طرح ملیں ہیں کہ آج عرصے کے بعد' پہچان کا کوئی سلسلہ' تعلق کا کوئی سرا تلاش کر کے کوئی رشتہ قائم کرنے سے کیا حاصل ہے۔لیکن میری سوچ کا سفر بے سمت ہونے لگا۔ سچ ہے کہ ایسے وقت میں دل کب اپنے بس میں رہتا ہے مگر انسان تو پہلے ہی اپنی خواہش سے مجبور' عادتوں سے بے بس ہوتا ہے۔ شاید اسی لئے وہ چاہتے ہوئے بھی کچھ نہیں کر پاتا ہے۔

چائے ختم ہوئی تو میں کچھ دیر اور اس کیساتھ بتانے کے لئے کوئی بہانا' کوئی عذر ڈھونڈنے لگا اور اس گفتگو کو نیا موڑ دینے کی کوشش کی تو میری بیوی نے فوراً کہا۔''اب چلئے نا' کتنی دیر ہوگئی ہے۔ ابھی پوری شاپنگ باقی ہے اور گھر پر بچے بھی انتظار کر رہے ہوں گے''۔

''نابغہ' ہمیں بھی چلنا چاہئے۔ گھر پر آج میرے آفس کے دوست چائے پر آنے والے ہیں''۔ یہ کہہ کر اس کے شوہر نے پھر میری طرف دیکھا اور کہا۔''اچھا تو جناب' ہم چلتے ہیں' بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر' بھئی پھر ملیں گے''۔

''ہاں ضرور ملیں گے.....!'' کہنے کو میں نے کہہ دیا لیکن اپنے ہی الفاظ مجھے بے معنی نظر آئے اور ان بے معنی الفاظ کی شدت نے احساس دلایا کہ جیسے ایک بار پھر وہ سارے سلسلے ٹوٹ کر بکھر گئے ہو۔ اور وہ سارے منظر یکا یک کہیں

گم ہو گئے ہیں۔ جو ابھی ابھی میری اطراف بڑی شدت سے پھیل گئے تھے۔ وہ ساری رفاقتیں، ماضی کی وہ سب باتیں، وہ سب قصے، وہ سارے یادگار لمحے، اب گزرے کل کا محض ایک حصہ بن کر رہ گئے ہو۔ محبتوں کی آگ، وقت کے ہاتھوں ایسی سرد ہوئی کہ چنگاری بھی باقی نہیں رہی اور پھر ہم جدا ہو گئے اور آج ملے بھی تو سمندر کے دونوں کناروں کی طرح۔ جو کبھی مل نہیں سکتے۔ شاید اسی لئے ہم مل کر ایک بار پھر یوں بچھڑ گئے وہ اپنے شوہر کے ساتھ اور میں اپنی بیوی کے ہمراہ..... دونوں اپنے اپنے راستوں پر الگ الگ آگے بڑھ گئے لیکن میری اندر کوئی بدستور، بہت دیر تک پیچھے مُڑ مُڑ کر دیکھتا رہا۔ بس دیکھتا ہی رہا، مگر وہاں ان بیتے ہوئے حسین منظروں کے زوال کے سوا اب کچھ بھی نہ تھا"۔

"شیرازہ" میں چھپنے والی نگارشات

(۱) ہر نگارش کا معاوضہ پیش کیا جاتا ہے بشرطیکہ وہ غیر مطبوعہ اور غیر نشر شدہ ہو۔

(۲) ہندوستانی تاریخ و تمدن اور ثقافت و ادب کے مختلف پہلوؤں پر معیاری تحقیقی مضامین قبول کئے جاتے ہیں۔

(۳) ریاست کے تمدنی اور فنی ورثے کے بارے میں تحقیقی اور تنقیدی مقالات ترجیحی طور پر شائع کئے جاتے ہیں۔

(۴) فنِ تعمیر، آرٹ اور مصوری سے متعلق مضامین کے ساتھ آنے والی نادر تصاویر کا الگ سے معاوضہ دیا جا سکتا ہے۔

(۵) منظومات، بشرطیکہ معیاری ہوں، قبول کی جاتی ہیں۔

.....

سید رسول پونپر

منتخب کشمیری اُفسانے

منتخب کشمیری افسانے جیسا کہ نام سے ہی ظاہر ہے، بیس کشمیری افسانوں کا اردو ترجمہ ہے جو محترمہ مصرہ مریم کی تخلیقی کاوشوں کا ثمرِ عزیز ہے اور جسے انہوں نے کاروبارِ شوق جانکر ہی انجام دیا ہے ورنہ۔

بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل
کہتے ہیں جسے عشق خلل ہے دماغ کا

محترمہ مصرہ مریم اُردو کشمیری کے ممتاز و معروف شاعر، اَدیب اور نقاد پروفیسر حامدی کشمیری کی رفیقۂ حیات ہونے کے علاوہ تخلیق اَدب و علم و اَدب پروری کے مقدس شغل سے وابستہ ہیں، وہ سرینگر سے شائع ہونے والے اُردو کے معتبر رسالے ''جہات'' سے پچھلی ایک دہائی سے وابستہ ہیں جسکی وَساطت سے وہ کشمیری زبان اور اُردو ادبی حلقوں کے درمیان ایک دیرپا رابطے کا کام دے رہی ہیں۔ کشمیری زبان کے شہپاروں کو متعارف کرنے کے علاوہ انہوں نے حالیہ برسوں میں حامدی کشمیری کی حیات اور کارناموں کو ایک معتبر دستاویز کی صورت میں شائع کرکے اُپنی اَدبی زندگی میں گرانقدر اضافہ کردیا ہے۔ میں نے انہیں کئی بار اُپنے

ڈیسک پر ترجمے کے منتخبہ تخلیقی شغل میں مصروفِ کار پایا۔ بہت کم لوگ ایسے ہوتے ہیں جو ہمہ تن اپنے آپ کو انفرادی سطح پر کسی اَدبی کام کیلئے وقف کرتے ہوں۔ یہ حسنِ اتفاق ہی سمجھ لیجئے کہ مصرہ مریم کی مادری زبان کشمیری ہے اور اُردو زبان پر ماہرانہ دستگاہ ہونے کی بناء پر اُنکے کشمیری اَفسانوں کا زیرِنظر تخلیقی بازیافت ہونے کی بناء پر معتبر بھی ہے اور مستحسن بھی۔ زیرِنظر مجموعے میں مجھ ناچیز کے 'اَب کہاں جاؤ گے؟' کے علاوہ شام لال سادھو (بلائے بے درماں)، سومناتھ زتشی (چھک چھٹک چھٹک)، امین کامل (پھاٹک)، علی محمد لون (شُتیہ)، غلام نبی بابا (کردگاری)، تم ہی ہو، تم ہی ہو (اختر محی الدین) صوفی غلام محمد (مال دید)، حامدی کشمیری (ملبہ) ہری کرشن کول (ابھی تو رات ہے)، ہردے کول بھارتی (پلیٹ فارم کے اُس پار)، رتن لال شانت (پہلا سبق) بنسی نِردوش (ایک احساس)، ڈاکٹر شنکر رینہ (کچھ لکیریں کچھ نقطے)، اَمر مالموہی (آدم خور)، گلشن مجید (وہ)، انیس ہمدانی (ریڈیو اعلان کے بعد)، فاروق فیاض (سپیڈ بریکر)، ناصر منصور (سایہ)، محمد شعبان نورپوری کشمیری زبان کی بجا طور نمائندگی کر رہے ہیں۔ غلام نبی شاکر، شمس الدین شمیم، بشیر اختر، فاروق مسعودی اور خاتون افسانہ نگار تاج بیگم رینزو کے علاوہ مجید جہانگیر اور رشید راشد در سو کی غیر موجودگی کھٹکتی ہے۔ شاید مصرہ مریم نے انہیں اپنی اگلی کاوش کیلئے مخصوص رکھا ہو۔

اللہ کرے حُسنِ عمل اور زیادہ

حرفِ اوّل کے عنوان سے کشمیری افسانوں کے نمائندہ مجموعے کے ساتھ مختصر مگر جامع دیباچہ شامل کر کے مصرہ مریم نے اس کی معنویت و اَفادیت میں اضافہ کیا ہے۔ اِس میں ہوئی کچھ فروگداشتوں کی جانب اشارہ کرنا ضروری سمجھتا

ہوں تا کہ محترم قارئین کچھ غلط فہمیوں کا شکار ہونے سے بچ جائیں۔ حلقہ ادب حاجن سوناواری کی طرف سے ''وولر کَ ملر'' دایرہ ادب دلنہ کی جانب سے ''پرتو'' اور کشمیر یونیورسٹی کے شعبۂ کشمیری کی سرپرستی میں تحقیقی اور تنقیدی درسی رسالہ 'انہار' کی اشاعت اَب بھی آب وتاب کے ساتھ جاری ہے۔

مراز اَدبی سنگم کی سرپرستی میں ایک سالنامہ 'وتھہِ آگر' چھپتا تھا۔ اِسی طرح ادبی مرکز کمراز سوپور کے حُسنِ اہتمام سے ایک معتبر سالنامہ پہلے ''مشاہیرِ کمراز'' اور اب ''پرو'' کے نام سے باقاعدگی اور آب وتاب سے چھپتا ہے۔ غلام نبی خیال کی باصلاحیت اِدارت میں اخبار ''وطن'' ہفتہ وار ۱۹۶۵ء میں جاری ہوکے مسلسل پانچ سال تک چھپتا رہا جس کے بعد وہ مالی مشکلات کی وجہ سے بند ہوگیا۔ ناظم اطلاعات کے بی جنڈیال کی سربراہی اور محی الدین ریشی کی متحرک ادارت میں جو ''آلو'' (کشمیری دوماہی) باقاعدگی سے بڑی آب وتاب سے گزشتہ کئی سال سے چھپتا تھا وہی اَب کشمیری نژاد خواجہ فاروق کی سربراہی میں دم توڑ بیٹھا۔ غلام رسول سنتوش کی ادارت میں شائع ہونے والے ماہانہ رسالے، ''کاشُر اَدب'' ۱۹۶۷ء کا ذکر کرنا بھی لازمی ہے۔ کشمیر یونیورسٹی کے شعبۂ انگریزی کے انگریزی تحقیقی اور تدریسی مجلّہ کی کاوشیں بھی قابل ستائش ہیں۔ اِس میں نہ صرف کشمیری تخلیقات کے تراجم چھپتے ہیں بلکہ کشمیری زبان واَدب سے متعلق تحقیقی اور تنقیدی مضامین بھی جگہ پاتے ہیں۔ فاضل ترجمہ کار کو اَپنا سوانحی خاکہ بھی کسی طور ترجمہ کے اِس مجموعہ کے ساتھ شامل کرنا چاہیئے تھا تا کہ محترم قارئین اور محققین کے تجسّس وتلاش کی کماحقہ تشفی ہوسکے۔

اُردو اَدبی حلقے اِس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ ریاستی کلچرل اکادمی جس

کی اُردو ادب کے تئیں خدمات اظہر من الشمس ہیں کے حسنِ اہتمام سے اُردو تراجم کا ''پربت اور پنگھٹ'' کا سلسلہ چھپتا تھا۔ ماہنامہ شیرازہ (اردو) کا ترجمہ افسانہ نمبر بھی قابلِ تحسین ہے۔

اِنسانی تہذیب وزبان کے لین دین میں تراجم کا بڑا اہم رول رہا ہے۔ یہ لازمین شغل بہت ہی قدیم ہے جس میں فلسفہ، شاعری، تواریخ ومقدس کتب شامل ہیں۔ اِس طرح بہت ہی کٹھن اور مشکل ہونے کے باوصف ترجمے اور تصرف کا کام جاری ہے اور انشاء اللہ آئندہ بھی جاری رہے گا۔ بین الاقوامی سطح پر مذاہب کی رضا کارانہ اشاعت بھی ترجمہ کاری کی اعلیٰ ترین ومقدس ترین صورت ہے جو تا ابد جاری رہے گی۔ اَدبی، شعری ودیگر تراجم کا کام بھی انسان ذوق جمال کی تشفی کیلئے انفرادی اور اجتماعی سطح پر ہوتا رہے گا۔ تجربہ شاہد ہے کہ یہ مستحسن کام جتنا بھی سرکاری وغیر سرکاری سرپرستی میں کیا جائے اُتنا ہی اچھا ہے۔

''منتخب کشمیری اَفسانے کو اِسی سلسلے کی ایک اہم انفرادی کڑی تصوّر کیا جانا چاہئے۔ مصرہ مریم کی جستہ جستہ ترجمے کی کاوشیں قابلِ صد ستائش ہیں جو وہ پچھلے کئی سالوں سے کاروبار شوق سمجھ کر کرتی رہیں۔ تراجم کا مطالعہ کرتے وقت زبان کی بے ساختگی، شگفتگی اور رَوانی اوّل سے آخر تک ساتھ ساتھ چلتی ہے۔ تصنع کا بہت کم احساس ہوتا ہے جسکا نتیجہ یہی ہوتا ہے کہ افسانوں کا مطالعہ کرتے وقت قاری کی دلچسپی قائم رہتی ہے بلکہ اِسکے ذوقَ وجمال کی بھی تشفی ہوتی ہے۔ فاضل ترجمہ کار نے اصل متن کے رُوح کے قریب تر رہنے کی حتی الامکان کوشش کی ہے۔ اِس اَمر کی طرف انہوں نے حرفِ اَوّل میں خود بھی اشارہ کیا ہے:

''میں نے ترجمہ کرتے ہوئے حتی الامکان اصل متن کے قریب رہنے کی

کوشش کی ہے۔ میرا خیال ہے کہ ترجمہ کرتے وقت افسانہ ہو یا نظم اصل متن کو پیش نظر رکھنا لازمی ہے۔ ہر زبان کا اَدب اَپنے مخصوص کلچر اور لسانیات کا زائیدہ ہوتا ہے۔ ترجمہ کرتے وقت اِن مخصوص کلچرل عناصر کی بازیابی بھی ضروری ہے جن کے زیرِ اثر افسانے نے جنم لیا ہے۔ میری نظر ترجیحی طور ایک تو اَفسانہ نگاروں کے اُن افسانوں پر رُکی جو Content کا اعلان نامہ نہیں بلکہ متکلّم، مخاطب واقعہ اور کردار کے عمل اور ردِ عمل سے ایک تخیلی صورتِ حال پیش کرتے ہیں۔ اِس سے افسانہ حقیقت نگاری کے سادہ اور بیانیہ سے گریز کر کے ایک دلچسپ اور تہہ دار اکائی میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ دوسرے اُن افسانوں پر بھی میری نظر رُکی جو کشمیری زُبان، ماحول، سیاسی اور سماجی صورتِ حال کی فنکارانہ عکاسی کرتے ہیں۔

مجھے اِس بات کی خوشی ہے کہ خود کئی کشمیری اَفسانہ نگاروں نے بھی میری اِس کاوش کو پسند کیا ہے۔

سب سے بڑھ کر یہ کہ اُردو دُنیا میں اِن تراجم کی پذیرائی ہوئی جیسا کہ 'جُہات' میں مطبوعہ قارئین کے مکتوبات سے ظاہر ہے۔

''اس سے میرا حوصلہ بڑھا اور میں نے اعتماد کے ساتھ اِس پر کام جاری رکھا اور آج آپ کے سامنے اِن تراجم ایک مجموعہ پیش کر رہی ہوں۔''

اِنفرادی اور اجتماعی طور تخلیق کاری رُوح پرور اور مقدّس حیات آفرین شغل ہے جو ہمارے مقدر میں لکھے ہوشربا اور انتہائی حوصلہ شکن ماحول میں طباعت ونکاسی کے مراحل پر پہنچ کر خودکشی کے مترادف عمل کی شکل اختیار کرتا ہے کیونکہ کتابیں خریدتے وقت سرکاری وغیر سرکاری، انفرادی اور اجتماعی ادارے ایسا رویّہ اختیار کرتے ہیں جیسے

اہلِ ثروت جیسے دیتے ہوں غریبوں کو زکواۃ

کہا جاتا ہے کہ اسلوب ہی شخصیت ہے ایک تخلیق کار کی۔ دُوسرے الفاظ میں کہہ سکتے ہیں کہ اُسلوب ہی شخصیت ہے۔ اِس نظر سے بھی دیکھا جائے کہ کشمیری اَفسانے کے اِس انتخاب میں روایتی، جدید، تجریدی، مقصدی، اور علامتی اور سماجی سب افسانے شامل ہیں۔ اِس طرح اسکا اسلوب کی رنگارنگی بھی برقرار رکھی گئی ہے جس میں کہانیوں میں چھپے مزاحیہ، طنزیہ، ڈرامائی، طربیہ، اُلمیہ، بیانیہ بھی عناصر کو ملحوظِ نظر رکھا گیا ہے تا کہ غیر کشمیری اور کشمیری اُردو داں طبقے کو کشمیری کہانی کے ارتقائی منازل کا صحیح صحیح اندازہ ہو سکے۔ اِس طرح حُسنِ انتخاب کے ساتھ ساتھ مصرہ مریم کے تنقیدی شعور کا بھی قائل ہونا پڑتا ہے۔ آج جبکہ زندگی کی سبھی قدریں تجارتی ذہن کی زد پر ہیں، ہم فقط دَست بُدعا ہی ہو سکتے ہیں کہ اللہ خزانہ غیب ہی سے کاروبارِ شوق کی کفالت کرے۔

منتخب کشمیری افسانے کی کمپوزنگ، اسکا کاغذ، اسکی چھپائی اور اِسکا گیٹ اَپ نہایت ہی عمدہ اور دیدہ زیب ہے۔ مسعود عالم نے وفورِ شوق و محبت سے اسکا سَرورق اسطرح مزّین کیا کہ جیسے کشمیری کہانیاں نہ صرف اُچھوتی بلندیوں کی طرف محوِ پرواز ہیں بلکہ سبھی جھرنے بِلند کر پہاڑوں کو چیرتے ہوئے شوق کے صحرائے بسیط کو سیراب کرنے چلے ہوں۔ صلہ و ستائش کو فراموش کرتے ہوئے بقول غالبؔ

ہوں میں بھی تماشائی نیرنگِ تمنّا
مطلب نہیں کچھ اِس سے کہ مطلب ہی بر آوے

SHEERAZA (URDU)

Volume:46 No.3

Editor:
M.Ashraf Tak

Published by
J&K ACADEMY OF ART, CULTURE & LANGUAGES
Srinagar/Jammu

Printed at Jk Offset Printers, 315 Jama Masjid Delhi 110006